اپریل 2012
تعلیم و تربیت
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com
رنگ برنگے طوطے
صفحہ نمبر:32

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا | 71 واں سال 12 واں شمارہ | رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

اپریل 2012ء

اس شمارے میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

ایک بادشاہ اپنے درباریوں کے ساتھ ایک باغ کے قریب سے گزر رہا تھا کہ اُس نے دیکھا کہ باغ میں سے کوئی قیمتی سنگریزے پھینک رہا ہے۔ ایک سنگریزہ بادشاہ کو بھی آ کر لگا۔ اُس نے اپنے خادم کو دوڑایا کہ جا کر سنگریزے پھینکنے والے کو پکڑ کر لاؤ۔ کچھ دیر بعد خادم ایک گنوار آدمی کو پکڑ کر بادشاہ کے سامنے لے آیا۔ بادشاہ نے اُس آدمی سے پوچھا: ''تم نے یہ سنگریزے کہاں سے حاصل کیے ہیں؟''

آدمی نے جواب دیا: ''میں پہاڑ کی سیر کر رہا تھا کہ میری نظر ان خوب صورت کنکروں پر پڑی۔ میں نے ان کو جھولی میں بھر لیا۔ اس کے بعد چلتے چلتے اس باغ کی طرف آ نکلا اور ان کنکریوں سے پھل توڑنے لگا۔''

''کیا تم ان کنکروں کی قیمت جانتے ہو؟'' بادشاہ نے سوال کیا۔

نہیں، میں ان کنکروں کی قیمت نہیں جانتا۔''

''یہ معمولی کنکر نہیں بلکہ انمول ہیرے ہیں، جن کو تم نے اپنی نادانی سے ضائع کر دیا ہے۔''

بادشاہ کی بات سن کر وہ آدمی افسوس کرنے لگا، مگر اب افسوس کرنا بے کار تھا کیوں کہ وہ قیمتی اور انمول ہیرے اس کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو وقت عطا کیا ہے اُس کا ایک ایک لمحہ ہمارے لیے انمول ہیروں کی مانند ہے۔ ہم میں سے اکثر ان انمول ہیروں کو گنوار آدمی کی طرح معمولی کنکر سمجھ کر ضائع کرتے رہتے ہیں۔ جب یہ قیمتی وقت گزر جاتا ہے تو پھر حسرت و ندامت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ہمیں اپنے ایک ایک لمحے کی حفاظت کرنی چاہیے۔

اس مرتبہ جگہ کی کمی کے باعث سلسلہ ''آپ بھی لکھیے'' شاملِ اشاعت نہیں ہے۔ ان شاء اللہ اگلے شمارے میں یہ سلسلہ شامل کیا جائے گا۔ اس سلسلے کے لیے آپ مختصر کہانیاں ارسال کیا کریں۔ اُمید ہے آپ اس بات پر ضرور عمل کریں گے۔

اب آپ اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آراء و تجاویز سے آگاہ کیجیے۔

خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔

فی امان اللہ (ایڈیٹر)

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ ''تعلیم و تربیت'' 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361310-36361309 فیکس: 6278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہِ قائد اعظم، لاہور۔

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-6278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 500 روپے۔
مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔
ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔

قیمت فی پرچہ 25 روپے

قرآن مجید وہ آسمانی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی ﷺ پر نازل فرمائی اور اسے قیامت تک سرچشمۂ ہدایت قرار دیا۔ قرآن کریم کے بعد نہ کوئی کتاب آئے گی اور نہ حضرت محمد ﷺ کے بعد کوئی نبی آئے گا۔ اور یہ وہ کتاب ہے جس کی حفاظت خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

''بے شک ہم نے اس قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔'' (الحجر: آیت: ۹)

قرآن پاک ایک مقدس کتاب ہے، اسے پڑھنے کے بھی کچھ آداب ہیں اور سننے کے بھی۔ یعنی قرآن مجید پڑھنے اور سننے والے کو پورے ادب و احترام کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ ارشاد ربانی ہے۔ ''اور جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (الاعراف آیت ۲۰۴)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو سننے کے آداب خود ہی اس آیت میں بتا دیئے ہیں، ان میں سب سے اہم اور بنیادی ادب یہ ہے کہ جب قرآن مجید کی تلاوت ہو تو اسے نہایت توجہ، ادب اور غور سے سنا جائے اور درمیان میں کسی قسم کی دخل اندازی نہ کی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ دونوں (پڑھنے اور سننے والے) پر اپنا رحم فرمائے گا۔ اس سلسلے میں ہمارے سامنے صحابہ کرامؓ کا طرز بڑا واضح ہے۔ جب وہ حضور ﷺ سے قرآن مجید اور دین کی باتیں سنتے تو ان کی کیفیت ایسی ہوتی تھی کہ جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں کہ اگر وہ ذرا سی بھی حرکت کریں گے تو پرندے اڑ جائیں گے۔

قرآن مجید کے حوالے سے سبھی اہل ایمان کے دل و دماغ میں یہ بات نقش ہو جانی چاہیے کہ یہ ہمارے خالق کا کلام ہے۔ اگر ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمیں قرآن مجید سے محبت ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ یہ خالق کائنات سے محبت اور قرآن مجید سے دلی اور خصوصی لگاؤ ہے۔ جب ہم اپنے پروردگار سے دلی محبت کریں گے تو پھر ہماری دنیاوی اور اخروی کامیابیوں کے راستے کھلتے چلے جائیں گے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

''میری امت کے لیے سب سے بہترین عبادت قرآن مجید کا پڑھنا اور اس کی تلاوت کرنا ہے۔ قرآن مجید پڑھنا بلکہ اسے کثرت سے پڑھنا اور اس کی تلاوت ٹھہر ٹھہر کرنا ایک بہترین عمل ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔''

ایک اور جگہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''پروردگار کا فرمان ہے جو بندہ قرآن مجید کی تلاوت میں اس قدر مشغول ہو کہ اسے مجھ سے دعا مانگنے کا موقع نہ مل سکے تو میں اُسے بغیر مانگے ہی مانگنے والوں سے زیادہ دوں گا۔'' (ترمذی شریف)

قرآن مجید کی تلاوت کے آداب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اسے پڑھنے سے پہلے طہارت اور صفائی کا پورا اہتمام کیا جائے اور باوضو ہو کر پاک و صاف جگہ پر قبلہ رو بیٹھ کر پڑھا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور اپنے پروردگار کو دل ہی دل میں عاجزی اور خوف سے پست آواز سے صبح و شام یاد کرتے رہو اور غافل نہ ہونا۔'' الاعراف آیت: ۲۰۵

یہاں صبح اور شام کے حوالے دے کر نمازوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اپنے رب کو نمازوں کے اوقات میں نہایت ادب اور احترام کے ساتھ یاد کیا جائے اور اس میں ذرا بھی غفلت کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔ پست آواز سے مراد وہ آواز ہے جس میں ادب اور احترام ہو۔

آیئے! ہم سب اس بات کا عہد کریں کہ قرآن مجید کی تلاوت صبح و شام نہایت ادب و احترام سے کریں گے اور اس پہ عمل بھی کریں گے۔

پاکستان ہے پاکستان

دریا اور کہسار ہمارے
گُل بوٹے گل زار ہمارے
غلے کے انبار ہمارے
اللہ کا ہم پر احسان
پاکستان ہے پاکستان

اس کی شان بڑھائیں گے
علم کی جوت جگائیں گے
آگے بڑھتے جائیں گے
کر دیں گے سب کو حیران
پاکستان ہے پاکستان

بچو! سیکھو اور سکھاؤ
اک دوجے کا ہاتھ بٹاؤ
علم کی دولت کام میں لاؤ
ہو گی ہر منزل آسان
پاکستان ہے پاکستان

جوت: روشنی، اُجالا

کرامت بخاری

بدلہ

جس طرح ایک گندی مچھلی تالاب کے شفاف پانی کو آلودہ کرنے کا باعث بنتی ہے اسی طرح بلال احمد عرف بلو نے کلاس روم کے پُرسکون ماحول کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی مثال کچھ ایسی ہی تھی کہ جیسے کوئی جلد بازی کا مظاہرہ کر کے قطار میں کھڑے دُوسرے لوگوں کو قطار توڑ دینے پر مجبور کر دے۔ کلاس کے دُوسرے لڑکے بھی اب بلو کی تقلید کرنے لگے تھے، لیکن ایک لڑکا ایسا بھی تھا جو اس ماحول سے مطمئن نہیں تھا۔ اس کا نام عادل تھا۔ عادل کا تعلق ایک غریب مگر سلجھے ہوئے خاندان سے تھا۔ اس کے ابو کا کہنا تھا کہ نفرت کو نفرت سے مٹانا ممکن نہیں ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے۔

”نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتے...... بدی کا جواب نیکی سے دو۔ پھر تم دیکھو گے کہ تمہارا دشمن تمہارا کیسے سچا دوست بن جاتا ہے۔“

عادل بھی اسی راستے پر چلنے کا خواہش مند تھا، لیکن وہ معصوم اس راستے میں پیش آنے والی دشواریوں سے آگاہ نہیں تھا۔ وہ کانٹوں سے بھری شاخ کو سیدھا کرنے کا خواہش مند تھا، لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ کانٹے اکثر ہاتھوں کو بھی زخمی کرنے کا سبب بن جاتے ہیں اور آج بلو نے حرکت ہی ایسی کی تھی۔ اس نے اپنے قلم کو مخالف سمت میں دو تین جھٹکے دیئے تھے اور دُوسرے ہی لمحے عادل کے سفید کپڑے نیلی روشنائی کے دھبوں سے رنگ دار ہو گئے تھے اور اب تمام لڑکے آنکھیں پھاڑے عادل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ لمحہ قیامت خیز تھا۔ غصے کی شدت نے عادل کی سوچنے کی صلاحیت معطل کر کے رکھ دی۔ اس ایک لمحے میں عادل کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ جسم کا سارا خون چہرے میں سمٹ آیا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر ایک لمحے کے لیے بلو بھی لرز گیا تھا اور پھر کلاس روم میں موجود تمام طالب علم دھک سے رہ گئے تھے۔ عادل نے بجلی کی سی تیزی سے اپنے سکول بیگ کی زپ کھولی تھی۔ دُوسرے ہی لمحے نیلی روشنائی سے بھری ایک دوات اس کے ہاتھ میں نظر آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی بلو گھبرا گیا تھا اور پھر وہ ڈیسک کے کونے میں سمٹ گیا۔ آنے والے لمحات میں کیا ہونے والا تھا۔ اسے اس بات کا اچھی طرح احساس ہو چکا تھا۔ کلاس روم میں خاموشی طاری تھی۔ تمام لڑکے اب پوری توجہ اور دل چسپی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ بلو کی آنکھوں میں خوف کی لہر دوڑ گئی تھی اور اب وہ اپنے قیمتی لباس کے رنگ دار ہونے کا منتظر تھا۔

ایسا پہلی بار ہوا تھا جب کوئی اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ورنہ تو آج تک کسی نے اس کے سامنے کھڑے ہونے کی جرأت نہیں کی تھی۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ اگر کسی کو تکلیف دینے والی شرارت کرتا تھا تب بھی اس کے والدین خوش ہو کر اسے داد دیا کرتے تھے۔ کل بھی اُس نے ایسی ہی ایک حرکت کی تھی۔ وہ اپنے گھر کی چھت پر کھڑا تھا۔ اسی وقت ایک دیہاتی راہ گیر گلی میں سے گزرا۔ بلو کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا ایک غبارہ تھا۔ اس نے غبارہ تاک کر مارا تو بے چارہ دیہاتی بھیگ کر رہ

گیا۔ دیہاتی شکایت لے کر بلو کے ابو کے پاس آیا تو انہوں نے دلاسا دے کر اُسے چلتا کیا۔ بعد میں وہ بلو کے کارنامے پر خوب مسکرائے۔ بلو اپنے کارنامے پر مسرور کمرے میں چلا آیا۔ ابھی اسے ہوم ورک مکمل کرنا تھا۔ اس نے بیگ میں سے کتابیں نکالیں اور پھر ریاضی کی کتاب کھول کر بیٹھ گیا، لیکن کچھ دیر بعد ہی الجبر کے مشکل سوالات نے اس کے ذہن کا کباڑہ کر دیا۔ حل کیا ہوا ہر سوال غلط ہو جاتا تھا۔ تھوڑی دیر کی مشق کے بعد ہی اس کی ہمت جواب دے گئی۔ ایسے میں اچانک ہی اسے کچھ یاد آ گیا۔

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا..... عادل سے مدد لی جانی چاہیے.....''

وہ چٹکی بجا کر بولا اور پھر اپنی پسندیدہ بائیسکل پر سوار وہ عادل کے گھر کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ اس کے پاؤں پوری قوت سے حرکت کر رہے تھے اور پھر آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد وہ شہر کے مضافات میں پہنچ گیا۔ اب اسے دُور سے ایک بستی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ بستی میں پہنچتے ہی وہ اپنی بائیسکل سے اتر کر ایک تنگ سی گلی عبور کرتے ہوئے ایک نیم پختہ مکان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

اس نے بائیسکل ایک طرف دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی اور دروازے پر دستک دی۔

''کون ہے؟'' جواب میں فوراً ہی ایک نسوانی آواز سنائی دی تھی۔

''جی..... یہ میں ہوں بلال احمد.....'' اس نے فوراً جواب دیا۔

''بلال..... کون بلال؟'' سوالیہ انداز میں پوچھا گیا تھا۔

''میں عادل کا دوست ہوں۔ پہلی بار اس سے ملاقات کے لیے آیا ہوں۔'' اس کی بات ابھی جاری تھی کہ دروازہ کھل گیا۔ دروازے کے پیچھے ایک مہربان خاتون موجود تھی۔ پھر انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بیٹے عادل تو گھر میں نہیں ہے۔ اگر مناسب سمجھو تو انتظار کر لو.....''

''آپ عادل کی امی ہیں.....''

''ہاں بیٹے.....'' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر اسے ہمراہ لیے ایک کمرے میں چلی آئیں۔ بلو ایک طرف کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمرے کو بہت سادگی کے ساتھ آراستہ کیا گیا تھا۔ دیوار کے ساتھ دو عدد چار پائیوں پر بستر بچھا ہوا تھا۔ ایک پرانا صوفہ سیٹ بھی موجود تھا۔ بلو ابھی کمرے کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ اٹھتے قدموں کی آواز سن کر وہ دروازے کی طرف متوجہ ہو گیا، عادل مسکراتا ہوں چلا آ رہا تھا۔

''بلو تمہارا اس وقت آنا..... خیریت تو ہے نا۔''

''ہاں یار..... ایک کام تھا.....'' بلو اٹھتے ہوئے بولا۔

''کیسا کام؟'' عادل کا لہجہ سوالیہ ہو گیا۔

''عادل تم تو جانتے ہو کہ میں ریاضی کے معاملے میں کند ذہن ہوں.....''

''میں تو یہ جانتا ہوں کہ تم ہر معاملے میں کند ذہن ہو.....'' عادل نے اس کی بات کاٹ دی۔ بلو کو عادل کی دل لگی ناگوار محسوس ہوئی تھی، مگر وہ نظر انداز کر گیا۔

''ہاں تو مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم اپنے ہوم ورک کی نوٹ بک مجھے دے دو۔ میں الجبرا کا تمام کام نقل کر لوں گا اور سکول لے آؤں گا۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ ریاضی کے ٹیچر کتنے سخت ہیں۔ اگر تم نے نوٹ بک نہ دی تو صبح کلاس میں میری بے عزتی ہو گی۔ بات بات پر تو وہ ڈنڈا نکال لیتے ہیں.....'' بلو ایک ہی سانس میں کہتا چلا گیا۔ اس کی بات سن کر عادل کمرے سے باہر نکل گیا۔ جب وہ واپس لوٹا تو نوٹ بک اس کے ہاتھ میں بھی۔ وہ اسے بلو کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا:

''بلو..... تم میرے دوست ہو، نوٹ بک لے لو۔ لیکن ایک بات سن لو۔ یہ سب عارضی سہارے ہیں۔ مجھ سے نقل کر کے تم صبح استاد صاحب سے ملنے والی سزا سے تو بچ جاؤ گے لیکن جب بورڈ کا امتحان ہو گا تب تم کیا کرو گے.....؟''

''جب امتحان ہو گا تب دیکھا جائے گا.....'' بلو نے کہا۔

''مناسب طریقہ تو یہ ہے کہ تم پڑھائی میں دل چسپی پیدا کرو۔ اگر کوئی سوال سمجھ میں نہیں آتا تو اسے سمجھو..... اور ہاں تم مجھ سے بھی تو مدد لے سکتے ہو۔''

''مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم نوٹ بک نہیں دینا چاہتے تو نہ دو۔ بہانے مت بناؤ.....'' بلو کا لہجہ بہت بگڑا ہوا تھا۔ غصے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سکڑ گئی تھیں۔

''بلو، میری بات کو سمجھو، میں تمہاری بھلائی کے لیے کہہ رہا ہوں۔''

''میں اپنا نفع نقصان سمجھتا ہوں..... اچھا کل صبح سکول میں ملاقات ہو گی۔'' اتنا کہہ کر بلو اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر نکل

آیا۔ عادل سے ملنے والی نوٹ بک اس نے بائیسکل کے کیریئر میں پھنسائی اور تیزی سے پیڈل گھمانے لگا۔

"میری راہنمائی کرنے چلا ہے...... میری راہنمائی...... میں کوئی بچہ ہوں۔" اس کی سوچ زہریلی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ جلد ہی وہ اپنے گھر پہنچ گیا۔ اگلے آدھے گھنٹے میں وہ عادل کی نوٹ بک سے تمام سوال اپنی نوٹ بک پر اتار چکا تھا۔

وہ پھر عادل کے متعلق سوچنے لگا اور آخر اس نے دانت پیستے ہوئے عادل کی نوٹ بک میں سے وہ تمام صفحات پھاڑ کر علیحدہ کر لیے جن پر ہوم ورک کیا گیا تھا۔

"اب کلاس روم میں مزا آئے گا......" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

اگلے دن سکول پہنچتے ہی بلو نے عادل کی نوٹ بک اس کے حوالے کر دی۔ عادل نے نوٹ بک دیکھے بغیر اپنے بیگ میں رکھ لی۔ تیسرا پیریڈ ریاضی کا تھا۔ سر اشفاق کلاس روم میں آئے اور تمام لڑکوں کو ہوم ورک دکھانے کے لیے کہا۔ عادل نے جب نوٹ بک نکالی تو اس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا ہو۔ مطلوبہ صفحات غائب تھے۔ ایک لمحے کے لیے عادل کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے بے بسی سے بلو کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔ بلو مسکرا رہا تھا۔

"عادل تمہارا ہوم ورک کہاں ہے؟" سر اشفاق نے عادل سے پوچھا۔

"س...... سر میں ہوم ورک نہیں کر پایا۔" عادل نے سر جھکا لیا۔ خیر اور شر کی جنگ اپنے عروج پر تھی۔ عادل نے بلو کو صاف بچا لیا تھا اور اس کے جھوٹ پر بلو سنگ کر رہ گیا تھا۔ عادل نے دوبارہ کہا تھا۔

"سر! مجھے معاف کر دیجیے...... میں ہوم ورک نہیں کر پایا۔"

"لیکن پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔" سر اشفاق اپنے چشمے کے پیچھے سے اُسے گھور رہے تھے۔

"سر...... کچھ مصروفیات تھیں......" عادل کا لہجہ بہت دھیما تھا۔

"ہوں تو یہ بات ہے......" سر اشفاق کہہ رہے تھے۔ "آج تمہیں رعایت دیتا ہوں لیکن کل سارا ہوم ورک مکمل ہونا چاہیے۔"

انمول موتی

- خوش نصیب وہ نہیں جس کا نصیب اچھا ہے بلکہ خوش نصیب وہ ہے جو اپنے نصیب پر خوش ہے۔
- اللہ کا خوف سب سے بڑی دانائی ہے۔
- کانٹوں سے بھری ایک ٹہنی کو پھول خوب صورت بنا دیتا ہے۔
- عزت دل میں ہونی چاہیے لفظوں میں نہیں اور [illegible] لفظوں میں ہونی چاہیے دل میں نہیں۔
- مسکراہٹ دشمنی کو ختم کرنے والا ہتھیار ہے۔
- مصائب سے مت گھبراؤ کیونکہ ستارے اندھیرے ہی میں چمکتے ہیں۔

(سرمد شمریز، آزاد کشمیر)

سر اشفاق اتنا کہہ کر آگے بڑھ گئے اور عادل خوش ہو گیا۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی جب کہ بلو اُسے گھور کر رہ گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس [illegible] رہا تھا۔ پھر اس کے دماغ پر جیسے جنون سوار ہو گیا۔ پیریڈ ختم ہوا تو سر اشفاق کمرے سے باہر نکل گئے۔

ان کے جاتے ہی کلاس روم میں شور برپا ہو گیا۔ تمام لڑکے کھیل کود میں مصروف ہو گئے۔ شرارتیں کرنے لگے۔ قہقہے لگانے لگے اور پھر جیسے ان کے قہقہوں کو بریک لگ گئی۔ بلو نے اپنے ہاتھ میں موجود قلم کو مخصوص انداز میں جھٹکا دیا تھا اور قلم میں موجود روشنائی عادل کے کپڑوں پر پھیل گئی تھی اور اب عادل کے ہاتھ میں روشنائی سے بھری دوات موجود تھی۔ بلو کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار موجود تھے۔ اس کی پیشانی پسینے کی بوندوں سے آلودہ ہو چکی تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کے سامنے ذلیل ہونے کے تصور ہی سے کانپ کر رہ گیا تھا اور پھر عادل کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ روشنائی سے بھری دوات پر اس کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ بلو نے متوقع انجام کے پیش نظر اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ایسے میں عادل کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"تمہارے قلم میں موجود روشنائی ختم ہو چکی ہے نئی بھر لو......"

اس کی بات میں جانے کیا اثر تھا: بلو کا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا سر شرمندگی کے بوجھ تلے جھک گیا۔ شیطانی جذبہ اپنی موت آپ مرگیا تھا اور اب فضا میں امن کی مہک رچ بس گئی تھی۔

ہونہار مصور

مانو بلی

زوہا فاطمہ، صادق آباد (پہلا انعام 175 روپے کی کتب)

اقصیٰ شہزادی، گجرات (دوسرا انعام 150 روپے کی کتب)

محمد حسن فاروق، لاہور (تیسرا انعام 125 روپے کی کتب)

فاطمہ تصیر، اسلام آباد (چوتھا انعام 100 روپے کی کتب)

محمد مختار، واہ کینٹ (پانچواں انعام 90 روپے کی کتب)

ثناء جمال، اسلام آباد (چھٹا انعام 75 روپے کی کتب)

اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: رحما سعید، قلعہ دیدار سنگھ۔ سیدہ حسنہ احسان، لاہور۔ حمزہ علی، راول پنڈی۔ اقراء بشیر گھوکھ، واہ کینٹ۔ محمد آصف امین، سعدیہ نورین مغل، بھکر۔ سیدہ فائقہ رحمان، بہاول پور۔ محمد علی حذیفہ، گوجرانوالہ۔ راجہ محمد زبیر جمشید، خانیوال۔ محمد عمیر، راول پنڈی۔ محمد احسن علی، چکوال۔ آمنہ بتول، اسلام آباد۔ محمد جواد حسن، پشاور۔ آنسہ آصف، ازما اظہر، سید محمد اسامہ، عبدالستار، سیدہ دانیہ بتول، مبشر خان، لاہور۔ محمد عبداللہ سعید، جہلم۔ ماہا مائیکل، ساہی وال۔ رمشاء ارشد، حارث علی، راول پنڈی۔ علی غلام جیلانی، کراچی۔ زین احمد قریشی، سانگھڑ۔ ناصر حماد الرحمٰن، گجرات۔ مقدس اسلم، بھلوال۔ محمد بن سلیم، کراچی۔ احمد فرید خان، چکوال۔ اریبہ خان، اسلام آباد۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

مئی کا موضوع: طلوع آفتاب کا منظر — آخری تاریخ 8 اپریل

جون کا موضوع: غبارے والا — آخری تاریخ 8 مئی

بابو کباب والا

محمد فاروق دانش

اچانک دونوں ایک دم چپ ہو گئے۔ ارسلان حیرت سے اُن کی جانب دیکھنے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ بار بار عقبی جانب دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر خوف کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کی حالت بھی اُن دونوں جیسی ہو گئی۔ وہاں منظر ہی کچھ ایسا تھا۔ دو مسلح افراد ہاتھوں میں اسلحہ لیے کھڑے تھے۔ ان کے مکروہ چہروں کو دیکھ کر خوف کا بڑھ جانا لازمی امر تھا۔

"کک.... کون ہیں.... آآآپ لوگ؟" ارسلان اس حالت میں بغیر اسلحے کے کوئی اس طرح اس کے گھر میں بلا اجازت گھس آیا ہوتا تو وہ اس کو خوب لتاڑتا، لیکن اس وقت اسلحہ کے سامنے تو اس کی آواز بھی ٹھیک طرح نہیں نکل پا رہی تھی۔

"بابو کہاں ہے؟" انھوں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنا سوال داغ ڈالا۔

"وہ تو سامان لینے بازار گئے ہیں، لیکن آپ لوگ....." وہ اس کے والد کے بارے میں سوال کر رہے تھے۔

"ہم سے زیادہ سوال جواب کرنے کی کوشش نہ کرو۔" گھنی مونچھوں والے لمبے قد کے آدمی نے بندوق کو لہراتے ہوئے کہا۔

"بابو کو آخری بار سمجھانے آئے ہیں کہ وہ ہمارا کہنا مان لے ورنہ....." دُوسرے آدمی نے جس کے چہرے پر زخم کا نشان تھا، دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"تم لوگ.... اس طرح ہمارے گھر میں کیسے گھس آئے؟" وہ بمشکل تھوک نگلتا ہوا بولا۔ ویسے اسلحہ کی نمائش جس انداز سے ہو رہی تھی اس میں کسی سے یہ سوال کرنا ہی مناسب نہ تھا۔

"تم دیکھ نہیں رہے کہ ہم اپنے ساتھ کیا لائے ہیں؟" ایک آدمی نے اپنی گن پر ہاتھ مارتے ہوئے اسے احساس دلانے کی کوشش کی۔ "شکر کرو! ہم یہاں ڈاکا نہیں مار رہے، ورنہ تم ہمیں لوٹنے سے بھی نہیں روک سکتے۔"

وہ دونوں ایک دُوسرے کو دیکھتے ہوئے اس انداز سے بولے۔ بات ان کی معقول تھی اور ان کا جارحانہ انداز بتا رہا تھا کہ اگر ان سے زیادہ کرید کی گئی تو وہ انھیں نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ شارق اور طارق کی بد قسمتی کہ وہ ایسے وقت کیرم کھیلنے آئے، جب ارسلان کے گھر ڈاکو آگئے تھے۔

"اچ... اچھا... ہم چلتے ہیں ارسلان..." وہ اس افتاد سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔

"چپ چاپ بیٹھے رہو لڑکے.... زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کی تو...." مونچھوں والے نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا جب کہ دُوسرے نے اپنی گن ان دونوں پر تان لی۔ ارسلان نے اپنے حواس بحال کرتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے دوست ہیں، انھیں جانے دو۔"

"زیادہ ہوشیاری نہیں چاہیے، ہمارے جانے تک کوئی یہاں سے نہیں ہلے گا۔"

احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ ان کی بات مان لی جائے۔ وہ ایک بار پھر صوفے پر بیٹھ گئے۔

"ہم بابو کو مل کر ہی جائیں گے۔" وہ دونوں بھی صوفوں پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

ارسلان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس ناگہانی مصیبت سے کیسے جان چھڑائے۔

ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اس کے والد سامان سے لدے پھندے گھر میں داخل ہوئے۔ ان کے گھر میں گھستے ہی وہ دونوں ایک مرتبہ پھر ہوشیار ہو گئے۔

"کک.... کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟" بابو بھائی ایک دم پریشان ہو کر بولے۔

"تمھیں کئی بار ہم نے سمجھایا ہے، لیکن تم مان کر نہیں دے رہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔" وہ انھیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اسے کیے علم ہوتا کہ وہ کس لیے آئے ہیں۔

"میں تو آپ لوگوں کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔"

"ہم شیرا کے آدمی ہیں۔" زخمی چہرے والے شخص نے رعونت سے جواب دیا۔

"اوہ اچھا.... " وہ پریشان ہوتے ہوئے بولے۔ ان کے ماتھے پر پسینا صاف نظر آنے لگا تھا۔

"آج ہم آخری وارننگ دینے آئے ہیں، اگر خون خرابا نہیں چاہتے تو ہماری بات مان لو۔" بڑی مونچھوں والا بولا۔

"اگر اب بھی شیرا کی بات نہ مانی تو پھر ..... ہمارا فیصلہ یہ بندوق کرے گی۔" دوسرے شخص نے ایک بار پھر بندوق سب کے سامنے تانی۔ پہلے آدمی نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے چھوٹی میز کو اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے گرایا اور وہ دونوں مزید کچھ کہے بغیر کمرے کے دروازے سے باہر نکلتے چلے گئے۔ بابو بھائی کے اوسان خطا تھے۔ وہ ابھی کچھ بات کرنے کے لائق نہیں رہے تھے جب کہ ارسلان اور اس کے دوست ان سے بدمعاشوں کے مطالبے کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھے۔ اس کے دوست نے اشارہ کیا تو اسلان اندر سے پانی کا گلاس بھر لایا۔ انھوں نے پانی پیا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

.......☆.......

خوش بو ایسی تھی کہ لوگوں کا دل موہ لیتی تھی۔ وہاں سے گزرنے والا اگر ایک بار وہ خوش بو پا لیتا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے قدم وہاں رک جاتے۔ وہ بے اختیار اس بن کباب والے کی دکان کا رخ کر لیتا اور ایک آدھ کباب تو ضرور کھاتا۔ بابو بن کباب والے کا ایک چھوٹا سا کیبن بازار میں کوئی عرصہ پندرہ سال سے قائم تھا۔ اس بازار میں کھانے پینے کی کئی اشیا دست یاب تھیں لیکن بابو کے بن کبابوں کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ یہاں بن کباب کھانے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ شام سے رات گئے تک بابو بن کباب بناتا رہتا اور لوگ کھاتے رہتے اور یوں اس کی دکان داری بہترین طریقے سے چلتی رہی۔ اس کے سامنے کئی کباب بیچنے والے نت نئے طریقے لے کر آئے لیکن اپنی دکان داری نہ جما سکے اور بالآخر وہاں سے انھیں جانا پڑا۔ بابو اپنی جگہ ہی رہا بل کہ اس کی سیل بڑھتی ہی رہی۔

کچھ دنوں قبل بابو کے کیبن کے برابر ایک بڑی سی دکان میں شیرا نامی آدمی نے بے حد آرائش کے ساتھ ایک خوب صورت دکان قائم کی جس میں چھتے اور نت نئے انداز کے برگر رکھے گئے۔ دکان کی چکا چوند بھی بہت تھی اور اس کی تشہیر بھی بہت کی گئی۔ شروع کے چند دن تو لوگوں نے اس کے نئے پن کو دیکھتے ہوئے اس کی دکان کا رخ کیا لیکن جو لذت بابو کے بن کباب میں تھی، وہ ان مہنگے ترین برگروں اور سینڈوچ میں انھیں نظر نہیں آئی۔

آہستہ آہستہ گاہک پھر بابو کی دکان پر آنے لگے جب کہ شیرا کی دکان ویران ہونے لگی۔ شیرا نے لاکھوں روپے لگا کر ایک جدید انداز کی دکان بنائی تھی۔ اسے اپنی دکان میں یوں فارغ بیٹھے رہنا

اور بابو کے کیبن پر رش دیکھ کر غصہ آ رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر تاؤ کھاتا رہا۔ حسد کی آگ اُسے اندر ہی اندر جلائے جا رہی تھی۔

جب معاملہ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تو اس نے اپنی دُکان داری جمانے کے لیے بابو کو وہاں سے تنگ کر کے ہٹانے کے بارے میں سوچا۔ پہلے اس نے بلدیہ والوں کو اکسا کر اس کا کیبن وہاں سے ہٹوانا چاہا، لیکن وہ کیبن سڑک کے کنارے پر لگا ہوا تھا اور صرف ایک بابو ہی کا ایسا کیبن نہ تھا۔ اور بھی کئی لوگ اسی انداز کے کیبن چلا رہے تھے۔ بلدیہ والوں کے پاس کوئی جواز نہ تھا کہ وہ صرف بابو کا کیبن مسمار کر کے جاتے۔ جب یہ داؤ نہ چل سکا تو اس نے بابو کو لالچ دینا شروع کیا کہ وہ اس کے ہاں ملازم ہو جائے یا پھر اپنا کیبن اس کے ہاتھوں فروخت کر دے۔ بابو اپنے گھرانے کا گزر اوقات اسی کیبن سے کرتا تھا، وہ بھلا اپنی روزی کی جگہ اس کے حوالے کیوں کرتا۔ اور کچھ نہ بن پڑا تو شیرا نے اپنی دُکان کے ساتھ اس کا کیبن ہونے کی وجہ سے اس کیبن پر اپنا حق ملکیت جتانا شروع کر دیا اور لوگ اس کے پیچھے لگا دیے کہ وہ کسی طرح کیبن اس کے حوالے کر دے۔ شیرا کے اس طرح بے جا تنگ کرنے سے بابو نہ گھبرایا تو وہ دھمکیوں پر اُتر آیا۔ وہ کسی بھی طرح بابو کو وہاں سے فارغ کر کے علاقے میں اپنی برگر کی دُکان کو چمکانا چاہتا تھا۔ اور بابو کے لیے بھی وہاں سے ہٹنا زندگی اور موت کا سوال تھا۔

دو دن سکول میں ارسلان بالکل خاموش اور گم سم رہا۔ اس کی اس خاموشی کو کوئی اور نوٹ کرتا یا نہ کرتا، اس کے مخلص دوست احسن نے ضرور محسوس کر لیا۔ جب اس نے بہت کریدا تو اس نے ان غنڈوں کی دھمکیوں کے بارے میں بتایا۔

"دو روز سے ابو نے کام بند رکھا ہوا ہے۔ وہ بہت زیادہ سہم گئے ہیں۔"

"لیکن یہ مسئلے کا حل نہیں۔" احسن اس کی باتیں سن کر گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔

"میں اس مسئلے کا حل سوچتا ہوں، لیکن تم پُرامید رہو، انکل کی دُکان وہیں رہے گی۔" اس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

☆

بابو بھائی پر ان غنڈوں کی ایسی دہشت چھائی کہ وہ دُکان پر ہی نہیں گئے۔ ان کی بیگم نے بھی انھیں اس عمل سے باز رکھا تھا۔ شریف لوگ جھگڑے فساد سے ڈرتے ہیں اور ایسا کام جس میں جان بھی جانے کا خدشہ ہو تو انسان کو اور بھی سنجیدہ ہو کر سوچنا پڑتا ہے۔ پولیس سے، دُکان داروں کی انجمن یا کسی معزز آدمی سے مدد لینے کے پہلوؤں پر غور کیا گیا تھا لیکن ہر معاملے میں ان بندوق برداروں کی دھمکی یاد آ جاتی تھی اور وہ چپ ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔

"میرا خیال ہے مجھے اپنا ٹھکانہ چھوڑ کر کسی دُوسری مارکیٹ کا رخ کر لینا چاہیے۔" انھوں نے اپنی بیگم سے کہا۔

"ایسے لوگوں کی دشمنی سے تو یہی بہتر رہے گا۔" ان کی بیگم بھی بے حد ڈرپوک تھیں اور نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے شوہر یا ان کے کسی بچے کو کوئی نقصان پہنچے۔

"جو روزی ہمارے نصیب میں ہو گی وہ تو کسی دُوسرے بازار میں بھی مل ہی جائے گی۔" بابو نے بیگم کو مطمئن کراتے ہوئے کہا۔ وہ بھی خاموشی سے سر ہلا کر رہ گئی حال آں کہ بابو بھائی جانتے تھے کہ کسی دُکان کو جمانے کے لیے کس قدر وقت، توجہ اور جدوجہد صرف

کرنا پڑتی ہے تب کہیں جا کر برسوں بعد کام یابی ملتی ہے۔

☆

احسن نے کافی سوچ بچار کے بعد ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے ارسلان کو سمجھاتے ہوئے اپنا منصوبہ بتایا۔ اپنے والد کو راضی کرنے کے لیے اُسے خاصی محنت کرنا پڑی۔

”انکل! آپ بے فکر رہیں۔ ہم سب سنبھال لیں گے۔ آپ صرف دُکان کھولیں۔“ احسن نے انھیں اس قدر مطمئن کیا تھا کہ وہ ذہنی آسودگی محسوس کرنے لگے اور بہ خوشی دُکان کو دوبارہ کھولنے پر آمادہ ہوگئے۔

شیرا کی دُکان تو نہ چل سکی، لیکن وہ دور دور سے کیبن دیکھ کر اپنی کام یابی پر بے حد مسرور تھا۔ وہ بیٹھا اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا کہ ایسے میں اس نے دیکھا، بابو کا کیبن کھل گیا۔ اس نے حسب عادت اپنا مال لگانا شروع کر دیا۔ دُکان داری شروع ہو گئی۔ اس کے گاہکوں نے گلے شکوے شروع کر دیے۔ شیرا نے پیچ و تاب کھانا شروع کر دیا۔ وہ موبائل پر ادھر اُدھر نمبر گھمانے لگا۔ بابو کے بڑھتے گاہک اس کا میٹر تیزی سے گھما رہے تھے۔ وہ کسی صورت اسے برداشت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

احسن، ارسلان اور اس کے آٹھ دس دوست منصوبے کے مطابق کیبن کے اطراف الگ الگ ٹہل لگا رہے تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ کسی بھی قسم کی بدمعاشی کا وہ منہ توڑ جواب دینے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ احسن نے بہادر لڑکوں کا انتخاب کیا تھا اور ان سب کا عقیدہ تھا کہ زندگی اور موت تو صرف خدا کے ہاتھ میں ہے اور یہ کہ گیدڑ کی طرح جینے سے بہتر شیر کی زندگی گزارنا ہے۔ احسن کی ایسی ہی باتوں نے ارسلان کے دل میں بھی نئی امنگ جگا دی تھی۔

شیرا کی حرکت نے کام دکھایا۔ دو غنڈے بابو بھائی کی دُکان کے پاس آ چکے تھے۔ ارسلان نے انھیں پہچان کر احسن کو اشارہ کر دیا تھا۔ ابھی وہ اسلحہ کے ساتھ نہیں تھے، لیکن ان کے چہروں کی وحشت ہی کسی کو ڈرانے کے لیے کافی تھی۔ انھوں نے دُکان سے گاہکوں کے ہٹنے کا انتظار کیا اور جیسے ہی بابو بھائی کو اکیلا پایا، اس کے کیبن پر آ گئے۔

”لگتا ہے گولی کھا کر ہی تمھاری عقل کام کرے گی۔“ ایک نے دھمکی دی۔

”کیوں.... تم سر درد کی گولیاں بیچتے ہو کیا؟“ احسن نے کہا۔

”تم کون ہو لڑکے؟“ دوسرے آدمی نے غرا کر کہا۔

”میں چیمپئن ہوں چیمپئن....“ وہ اٹھلاتا ہوا بولا۔ ”اور وہ بھی کراٹے کا۔“

اسی بات چیت کے دوران ان کے تمام ساتھی آہستہ آہستہ وہاں جمع ہونے لگے اور انہوں نے ان دونوں کو گھیرے میں لے لیا۔

”لوٹنے آئے ہو لوٹنے....“ احسن نے زور زور سے بولنا شروع کیا۔ اس کے دوست ان کے گرد گھیرا مزید تنگ کر رہے تھے۔

”نن.... نہیں....“ ایک دم سے وہ شیر سے بکری بن گئے۔

"ہم تو کباب....."

"تمھیں شرم آنی چاہیے غریبوں کو لوٹتے ہوئے۔" احسن کے بازار میں چیخنے چلانے کا یہ اثر ہوا کہ لوگ جمع ہونے لگ گئے۔

"کیا.... یہ بابو بھائی کو لوٹنے آئے تھے؟" ایک نے کہا۔

"آج کل ان لٹیروں نے بڑا تنگ کیا ہوا ہے۔"

ایک اور دُکان دار نے کہا۔

"نہیں.... ہم ڈاکو نہیں ہیں۔" اتا رش دیکھ کر وہ گھبرا گئے تھے۔

"سب لٹیرے ایسے ہی کہتے ہیں۔"

ایک طاقت ور آدمی نے آگے بڑھ کر پہلے کو ایک گھونسا دے مارا۔ بس ایسے کاموں میں ابتدا ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر تو ان پر ہر طرف سے گھونسوں، لاتوں کی بارش ہونے لگی۔ شیرا نے جب پانسا پلٹتے دیکھا تو کسی کام کے بہانے وہاں سے کھسک گیا۔ اس نے سن لیا تھا کہ لوگ 15 پر فون کر کے پولیس کو بلانے کی باتیں کرنے لگے تھے۔

"ہم... ڈاکو.... نہیں...." وہ بڑبڑاتے رہے لیکن انھیں مار پڑتی رہی اور جب تلاشی کے دوران ان کی جیبوں سے اسلحہ برآمد ہو گیا تو لوگوں نے ان کی خوب پٹائی کی جس جس کا مال لٹا گیا تھا، جس کی جیب کٹی تھی یا کسی کا مال اچک لیا گیا تھا، ان سب نے ان کو اپنا مجرم گردانتے ہوئے اپنا غصہ ان پر نکالا۔ کچھ ہی دیر میں پولیس بھی آ گئی۔

"اوہ.....تو یہ اُٹھائی گیرے ہیں۔" تھانے دار نے ان کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ "اب کی بار ایسا پرچہ کروں گا کہ باہر ہی نہیں آسکیں گے۔"

پھر دونوں کو پولیس نے وین میں ڈالا۔

"اگر آئندہ بھی آپ کو کوئی تنگ کرے تو بے دھڑک اطلاع کر دینا۔" تھانے دار نے بابو بھائی سے کہا۔

"ارے ہم سب مارکیٹ والے بابو بھائی کے ساتھ ہیں۔" ایک دُکان دار نے کہا۔

"ہاں، اگر کوئی بھی مسئلہ ہو، ہم ہیں ناں!" انجمن دُکان داران کے سیکرٹری نے ایسے جملے ادا کیے کہ بابو بھائی کا سیروں خون بڑھ گیا، اب انھیں یقین ہو چلا تھا کہ ان کی دُکان یہیں رہے گی۔ ارسلان اور اس کے دوست اپنی کامیابی پر بہت خوش تھے۔

انمول باتیں

- لالچ، کنجوسی اور ایمان کبھی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔
- جس شخص کی عقل کامل ہو جاتی ہے وہ کم بولتا ہے۔
- کسی کی شرافت اور انسانیت کا اندازہ کرنا ہو تو اُسے قرض دے کر دیکھو، اس کا ہمسایہ بن کر دیکھو اور اس کے ساتھ سفر کر کے دیکھو۔
- اگر تو گناہ پر آمادہ ہے تو ایسی جگہ تلاش کر جہاں خدا نہ ہو۔
- گناہوں پر شرمندہ ہونا، ان کو مٹا دیتا ہے اور نیکیوں پر غرور کرنا ان کو برباد کر دیتا ہے۔
- تم نیک ہو اور لوگ تمھیں بُرا کہیں، یہ اس سے اچھا ہے کہ تم بُرے ہو اور لوگ تمھیں نیک کہیں۔
- جو اپنے دوست کو بُرے کام سے باز نہیں رکھ سکتا، وہ دوستی کے قابل نہیں۔
- اگر تم نیچے والوں پر ظلم کر رہے ہو تو اُوپر والوں کے انتقام کا انتظار کرو۔
- نااُمید ہونے سے عمر کم ہوتی ہے۔
- بولنے میں نرمی اختیار کرو۔ لہجے کا اثر الفاظ سے زیادہ ہوتا ہے۔
- جو ایک بار عہد شکنی کر چکا ہو اس پر کبھی اعتماد نہ کرو۔
- جو کرتا ہے اللہ کرتا ہے اللہ جو کرتا ہے صحیح کرتا ہے۔
- جو شخص اچھی کتابوں کو پڑھنے کا شوق نہیں رکھتا، وہ معراج انسانی سے گرا ہوا ہے۔
- استاد کا احترام کرنے والوں کی دُنیا عزت کرتی ہے۔
- ماں کی بددُعا سے بچو کیوں یہ بغیر رکاوٹ کے خدا کے پاس جاتی ہے۔
- پرانی لکڑی جلانے کے لیے، پرانے دوست اعتماد کے لیے اور پرانے مصنف مطالعے کے لیے بہترین ہوتے ہیں۔
- اگر تم اپنے تکبر کو توڑنا چاہتے ہو تو کسی غریب اور مفلس کو سلام کرو۔
- انسان کا حُسن اس کے اخلاق میں پوشیدہ ہے۔
- ایک سچا دوست ہیرے سے کم نہیں ہوتا۔

(محمد عثمان قاسمی، جھنگ)

ایک پہاڑ اور گلہری

علامہ اقبال

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم، تو پانی میں جا کے ڈوب مرے
ذرا سی چیز، اس پر غرور! کیا کہنا!
یہ عقل اور یہ سمجھ، یہ شعور! کیا کہنا!
خدا کی شان ہے ناچیز چیز بن بیٹھیں!
جو بے شعور ہوں یوں باتمیز بن بیٹھیں!
تیری بساط ہے کیا میری شان کے آگے؟
زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے
جو بات مجھ میں ہے تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں
بھلا پہاڑ کہاں، جانور غریب کہاں!
کہا یہ سن کر گلہری نے، منہ سنبھال ذرا
یہ کچی باتیں ہیں دل سے انہیں نکال ذرا!
جو مَیں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا!
نہیں ہے تُو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا
ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
کوئی بڑا، کوئی چھوٹا، یہ اس کی حکمت ہے
بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اُس نے
مجھے ورخت پہ چڑھنا سکھا دیا اُس نے
قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں
نری بڑائی ہے! خوبی ہے اور کیا تجھ میں
جو تُو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو
نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

اسکوائش

محمد توفیق

دُنیا کے قدیم ترین کھیلوں میں ایک اسکوائش بھی ہے۔ بعض تاریخی حوالوں سے پتا چلتا ہے کہ اس کی ابتداء متعدد دوسرے کھیلوں کی طرح قدیم یونانیوں اور رومیوں ہی کے دور میں ہوئی۔ ان تہذیبوں کی بدولت اسکوائش کا کھیل شمال مغربی یورپ تک جا پہنچا جہاں یہ ۱۸ ویں صدی میں ریکٹس کے نام سے کھیلا جاتا تھا۔ موجودہ دور کا اسکوائش دراصل ریکٹس نامی قدیم کھیل کی تبدیل شدہ شکل ہے۔

ریکٹس کے متعلق یہ امر انتہائی حیران کن ہے کہ اس کھیل کی بنیاد ایک جیل خانے میں رکھی گئی۔ پس منظر کچھ یوں ہے کہ ۱۸ ویں صدی میں انگلستان میں رواج تھا کہ جو شخص قرض لینے کے بعد مقررہ مدت تک واپس نہ کر پاتا تو اسے کسی بھی جیل خانے میں نظر بند کر دیا جاتا یوں تو ایسے جیل خانوں کی کوئی کمی نہ تھی لیکن ان سب میں لندن کا فلیٹ جیل خانہ بہت مشہور تھا۔ یہاں تک کہ اس جیل خانے کا ذکر انگریزی کی بعض اہم ادبی اور تاریخی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ریکٹس کی ابتدا اسی جیل خانے میں مقروضوں کے ہاتھوں ہوئی۔ فلیٹ جیل خانے میں ہمیشہ ایسے کئی افراد نظر بند رہتے۔ ان میں کچھ تو بوڑھے اور نادار لوگ ہوتے اور کچھ ایسے جن کے ہاتھ پیروں میں جان تھی اور وہ قرض واپس نہ کرنے کی ندامت اور شرم سے بھی عاری تھے۔ کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا حاصل ہی تھا۔ پس جیل میں اگر کوئی کمی محسوس ہوئی تو وہ وقت گزاری کے لیے کسی مشغلے کا نہ ہونا تھا۔ لہٰذا وہ چیتھڑوں اور طرح طرح کے بلے استعمال کرتے ہوئے ایک کھیل کھیلنے لگے جو بعد میں ریکٹس کہلایا۔ انگریزی کے شہرہ آفاق ادیب چارلس ڈکنز نے اپنے مشہور ناول، پک وک پیپرز، میں اس کھیل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ کھیل اس زمانے کے قیدیوں میں بہت مقبول تھا۔

ریکٹس کی تاریخ میں یہ بات بھی تعجب خیز ہے کہ جس کھیل کی بنیاد جیل خانے میں پڑی اور جو برطانوی قیدیوں میں بہت مقبول رہا، اسے شہرت دوام طالب علموں کے ہاتھوں نصیب ہوئی۔ ریکٹس کے کھیل کا رواج ۱۸۳۰ء میں انگلستان کے تعلیمی اداروں میں کیونکر ہوا اس کی تفصیلات واضح نہیں ہیں، لیکن یہ حقیقت مسلم ہے کہ ہارو (Harrow) سکول کے طلبہ نے ۱۸۳۲ء میں ریکٹس کا کھیل اپنا لیا۔ جب یہ طلبہ فارغ التحصیل ہو کر زندگی کے مختلف شعبوں میں

داخل ہوئے تو ان کی بدولت یہ کھیل معاشرے کے مختلف شعبوں میں مقبول ہونے لگا۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۴ء تک انگلستان کی یونیورسٹیوں، نجی کلبوں اور انگلستان کے فوجیوں میں ریکٹس کا دور دورہ ہو گیا۔

انگریز فوجیوں کی بدولت چند سال میں یہ کھیل انگلستان کی سرحدیں عبور کرتا، کینیڈا، امریکہ، مالٹا، ارجنٹائن اور بعد میں برصغیر میں داخل ہوا۔ ریکٹس کی تاریخ میں ۱۸۸۸ء کا سال بڑی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اسی سال انگلستان کے کوئنس کلب کے زیر اہتمام شوقیہ کھلاڑیوں کی پہلی چیمپئن شپ منعقد ہوئی۔ ۱۸۹۰ء میں پہلی بار اس کھیل کے قواعد بنائے گئے۔ قواعد بنانے والوں میں دو اہم نام جولین مارشل اور میجر اسپنس کے ہیں۔ واضح رہے، جولین مارشل وہ مشہور تاریخ دان ہے جس نے ٹینس کی تاریخ تحریر کی تھی میجر اسپنس کا شمار ریکٹس کے کھیل پر مکمل عبور رکھنے والے کھلاڑیوں میں ہوتا تھا۔ واضح رہے کہ ریکٹس آج بھی بعض ممالک میں کھیلا جاتا ہے۔

ریکٹس کی طرح اسکوائش کے کھیل کی ابتداء بھی ہارو اسکول میں ہوئی۔ ہوا یہ کہ بہت سے طالب علم جو ریکٹس کھیلنے کورٹ نہیں جا سکتے تھے، دل بہلانے کے لیے ہاسٹل کے صحن کی دیواروں سے ربڑ کی گیند سے کھیلنے لگے۔ یوں کورٹوں کی کمی کے باعث آہستہ آہستہ اسکوائش نے مقبولیت حاصل کر لی۔ ۱۸۶۴ء میں ہارو میں اسکوائش کے اولین چار کورٹ تعمیر کیے گئے۔ قارئین کے لیے یہ بات باعث دل چسپی ہوگی کہ اسکوائش کا نام دراصل اس کی گیند کی آواز کی مناسبت سے پڑا۔ دراصل کھلاڑی جب گیند زور سے دیوار پر مارتے، اس سے اسکوائش کی مخصوص آواز نکلتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آغاز میں ریکٹس میں بہت سخت گیند استعمال ہوتی تھی۔ یوں نو آموز کھلاڑیوں کے چوٹیں آ جایا کرتیں۔ لہٰذا کم عمر طالب علموں کو نرم گیند دے کر چھوٹے گراؤنڈ میں مشق کروائی جاتی۔ بڑے طالب علم چھوٹے گراؤنڈ کو از راہِ تمسخر 'اسکوائش' کہنے لگے۔ بعد میں یہی لفظ اس کھیل کا نام بن گیا۔

جب دُنیا کے افق سے پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۹ء) کے بادل چھٹے اور بارود کی گھٹن آلود فضا کے بعد تازہ ہوا میں سانس لینا ممکن ہوا تو دوسرے کھیلوں کی طرح اسکوائش کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ ۱۹۲۰ء میں اسکوائش کے پیشہ ور کھلاڑیوں کی پہلی چیمپئن شپ لندن میں منعقد کی گئی۔ دو سال بعد شوقیہ کھلاڑیوں کے لیے بھی چیمپئن شپ کا انعقاد کیا گیا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ مرد اور خواتین کھلاڑیوں کے چیمپئن شپ ایک ہی سال میں شروع ہوئے۔ یہ منفرد اعزاز غالباً صرف اسکوائش ہی کو حاصل ہے۔ دوسرے کھیل پہلے تو مردوں میں مقبول ہوئے اور اس کے کچھ عرصے بعد بلکہ بعض کھیلوں کو تو صدیوں بعد خواتین نے اپنایا۔ تاریخ اسکوائش میں ایک انقلاب اس وقت رونما ہوا جب ۱۹۳۰ء میں لندن میں برٹش اوپن اسکوائش چیمپئن شپ کے نام سے مقابلے شروع ہوئے۔ یہ مقابلے اب باقاعدگی کے ساتھ ہر سال ہوتے ہیں۔ انہیں اسکوائش کی عالمی چیمپئن شپ تصور کیا جاتا ہے۔

۱۹۳۳ء میں عظیم مصری کھلاڑی، ایف ڈی امر بے نے پانچ مرتبہ برٹش اوپن جیتی۔ اس کی تقلید میں ایک اور مصری کھلاڑی، ایم کریم نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک چار مرتبہ یہ اعزاز جیتا۔ بعد میں پاکستان کے 'خانوں' کی کامیابیوں کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ ہاشم خان (۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۸ء)، روشن خان (۱۹۵۷)، اعظم خان (۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۲ء)، محب اللہ خان (۱۹۶۳)، جہانگیر خان (۱۹۸۲ء سے ۱۹۹۲)، جان شیر خان (۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۹ء) تک۔ اسکوائش کی مقبولیت میں دو کھلاڑیوں، آئرلینڈ کے جوناہ بیرنگٹن اور آسٹریلیا کے جیف ہنٹ کا بھی نمایاں کردار ہے جو ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء کے عرصے میں اسکوائش کے افق پر چھائے رہے۔ دل چسپ بات یہ کہ خواتین کی برٹش اوپن کا آغاز مردوں سے بھی پہلے ۱۹۲۲ء میں ہوا۔ پہلی چیمپئن شپ انگلستانی کھلاڑی، مس کیو (Cave) نے جیتی۔ اس کے بعد یہ اعزاز ۱۰ مرتبہ انگلستان کی جینٹ مورگن نے جیتا۔ پھر خواتین اسکوائش کی سب سے بڑی کھلاڑی، آسٹریلیا کی ہیتھر میکے (Heather Mckay) منظر عام پر آئی۔ اس نے ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۷ء تک راج کیا اور اپنے گیارہ سالہ کیریئر میں ناقابلِ شکست رہی۔

اسکواش کی تاریخ پاکستان کے عظیم 'خانوں' کے بغیر نامکمل رہے گی۔ ہاشم خان نے ۱۹۵۱ء میں پینتیس سال کی عمر میں پہلی برٹش اوپن جیتی۔ اس کے بعد تو گویا دروازہ کھل گیا۔ اعظم خان، محب اللہ خان، روشن خان، آفتاب جاوید، گوگی علاؤ الدین، یاسین، قمر زمان، محب جونیئر، ہدایت جہاں اور پھر جہانگیر خان اور جان شیر خان جیسے عظیم پاکستانی کھلاڑیوں نے چودہ سال تک عالمی اسکواش کو گھر کی باندی بنائے رکھا۔ آج اسکواش دُنیا کے ۱۴۰ ممالک کے ۵۰٬۰۰۰ کورٹس پر کھیلی جاتی ہے۔ اسے اولمپکس میں شامل کیے جانے کی کوششیں بھی کی جا رہی ہیں۔

پاکستان میں اسکواش کے سنہری دور کا ذکر ہاشم خان کے الف لیلوی تذکرے کے بنا ادھورا رہے گا۔ اسکواش اور ہاشم خان ایک چیز کے دو نام ہیں۔ پشاور کا یہ سادہ لوح پٹھان غالباً ۱۹۱۶ء میں پشاور سے چند میل دُور ایک چھوٹے سے گاؤں نوانے کلے (نیا گاؤں) کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ ہاشم خان کے والد، عبداللہ خان پشاور میں انگریزوں کے کلب میں ملازم تھے۔ ہاشم خاں بچپن میں اپنے والدین کے ساتھ کلب جاتے جہاں اسکواش بھی کھیلی جاتی تھی۔ اس زمانے میں کورٹ بغیر چھت کے ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا کھیل کے دوران گیند اکثر باہر چلی جاتی۔ یہ نو عمر اور پھرتیلا بچہ ہمیشہ تاک میں رہتا جیسے ہی گیند باہر جاتی، دوڑ کر اٹھا لاتا۔ اس کی مستعدی اور محنت دیکھ کر اسے ۵ روپے ماہوار پر بحیثیت گیند اٹھانے (Picker) ملازم رکھ لیا گیا۔ یہ معمولی ملازمت ہاشم خان کے لیے بڑی اہم ثابت ہوئی۔ اگر دیکھا جائے تو یہی ہاشم خان کے لیے عالمی چیمپئن بننے کا نقطہ آغاز ہے۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ شوق سودائی ہوا کرتا ہے، یہی بہتے پانی کی طرح اپنا راستہ خود ہی تلاش کر لیتا ہے اور راستے کے پتھروں کو بھی اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے یہی ہاشم خان کے ساتھ بھی ہوا۔ وہ ہر روز چلچلاتی دھوپ میں خالی پیٹ اسکواش کے کورٹ جا پہنچتے، تنہا پریکٹس کرتے، تھک کر چور ہو جاتے لیکن کھیل سے باز نہ آتے۔ خدا جانے کیسی لگن تھی کہ ایک روز اپنے ساتھی سے یہ طے کر بیٹھے کہ وہ اگر اسے کھیل کی تکنیک سکھا دے تو وہ ہر روز اُسے چار آنے دیں گے۔ یہ چار آنے انہیں دوپہر کے کھانے کے لیے ملا کرتے تھے۔ کیسی بھوک، کہاں کی بھوک! بھوک تو اسکواش کے کھیل کی تھی، کبھی نہ بجھنے والی، کبھی نہ مٹنے والی! وقت گزرتا گیا لیکن ہاشم خان کو سیری نہ ہوئی۔ ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ وہ اب مجبور تھے کہ کوئی مستقل ملازمت کریں۔ ہاشم خان نے پھر پشاور کے ایئر فورس کلب میں ۵۰ روپے ماہوار پر کوچ کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔

ہاشم خان نے ۱۹۴۴ء میں ایک انگریز، سائمن کے کہنے پر بمبئی میں منعقد ہونے والے آل انڈیا اسکواش ٹورنامنٹ میں حصہ لیا۔ فائنل میں چیمپئن باری خان کو شکست دے کر کل ہند چیمپئن ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء میں کامیابی کے ساتھ اپنے اعزاز کا دفاع کیا۔ ۱۹۴۹ء میں انہیں کل پاکستان اسکواش چیمپئن کا اعزاز ملا۔ ۱۹۵۰ء میں پاک فضائیہ کے ایک افسر گروپ کیپٹن رضا کی ذاتی کوششوں کے سبب پہلی بار برٹش اوپن اسکول چیمپئن شپ میں حصہ لیا۔ انہوں نے کھیل کے سامان کی دُکان سے ادھار ریکٹ اور کٹ حاصل کی۔ اس ادھوری کٹ کے بل بوتے پر دُنیا کے سب سے بڑے اسکواش ایونٹ میں حصہ لیا۔ ۱۹۵۱ء میں ہاشم خان نے تب کے بہترین عالمی کھلاڑیوں کو شکست دے کر پہلی بار عالمی اعزاز حاصل کیا۔ ہاشم خاں نے جن کھلاڑیوں کو شکست دی ان میں مصر کے محمود عبدالکریم بھی شامل تھے۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۷ء کے درمیان ہاشم خان سات بار عالمی چیمپئن رہے۔ یہ اعزاز اس سے پہلے کسی دُوسرے کھلاڑی کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس دوران ہاشم خان خاصے عمر رسیدہ ہو چکے تھے لہٰذا ان کے چھوٹے بھائی، اعظم خان نے ۱۹۵۸ء میں بڑے بھائی کا بار ہلکا کر دیا۔ اعظم خان کی کامیابی سے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ عالمی اعزاز ہاشم خان کے گھر ہی میں رہے گا، لیکن جان شیر خان کے بعد ان چراغوں میں روشنی نہ رہی اور نئی نسل اسلاف کے اثاثے کی حفاظت نہ کر سکی۔ آج اسکواش کا کھیل پھر کسی جہانگیر خان اور جان شیر خان کا منتظر ہے۔

نوید اپنے دوستوں کے ساتھ بازار سے گزر رہا تھا۔ وہ چلتے ہوئے جگہ جگہ تھوکتا جا رہا تھا۔ شہزاد کو اس کی یہ حرکت بہت بُری لگی۔ اس نے نوید کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ اس طرح جگہ جگہ تھوکنا اچھی بات نہیں۔ ایسا کرنے سے بہت سی بیماریاں پھیلتی ہیں۔ مکھیاں تھوک پر بیٹھ کر مختلف بیماریوں کے جراثیم ایک جگہ سے دُوسری جگہ منتقل کرتی ہیں۔ یہ بات نوید کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے اپنے دوست سے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ ایسا نہیں کرے گا۔ آئیے عہد کریں کہ آپ بھی نوید کی طرح جگہ جگہ نہیں تھوکیں گے۔ جو بچے ایسا کرنے کا عہد کرتے ہیں ان کے نام اگلے مہینے شائع کیے جائیں گے۔ اس عہد نامے میں شامل ہونے کے لیے کوپن ارسال کرنا ضروری ہے۔

شاباش

... کہ وہ جب بھی باغ میں جائیں گے وہاں پھول نہیں توڑیں گے۔

محمد سلمان حمید، گوجرانوالہ۔ عمر ناز دہلوی، علی جیلانی، فراز علی خواجہ، کراچی۔ محمد حارث بوٹا، ملتان۔ ناعمہ آصف، اسلام آباد۔ آمنہ سعید، دینہ۔ عاطف ملک، شیخوپورہ۔ رشنا ارشد، راولپنڈی۔ میر جواد، اسلام آباد۔ آمنہ مظہر، راولپنڈی۔ رجا سہیل، پشاور۔ حماد وٹو، اسلام آباد۔ مصعب سلطان، اسلام آباد۔ محمد ریحان طیب، راولپنڈی۔ محمد حذیفہ، چکسواری۔ عبید اللہ حامد، راولپنڈی۔ حافظ محمد بن مشتاق، رینالہ خورد۔ فضیلہ، واہ کینٹ۔ انصر صابر، وہاڑی۔ اسماء قریشی ملتان۔ حافظ سمیع اللہ، لاہور۔ نادیہ رحمٰن، راولپنڈی۔ سید احمد بخاری، بھکر۔ عمر فاروق، دینہ۔ تحریم آرش، بہاولپور۔ مریم خضر، وزیر آباد۔ رابعہ لائق، فیصل آباد۔ مریم خالد، لاہور۔ فاخرہ ساجد، کراچی۔ حسنین شاہ، راولپنڈی۔ شفق رضا، لاہور۔ تحریم فاطمہ، لاہور۔ محمد حسن، کراچی۔ نمرہ شاہین، سرگودھا۔ تحریم ظفر، لاہور۔ اُمِ حبیبہ، دینہ۔ کومل امجد، ملتان۔ زرناب جمال، گوجرانوالہ۔ سعد علی، سرگودھا۔ محمد عبداللہ، اسلام آباد۔ سارہ احمد، ٹیکسلا۔ محمد عثمان عابد، بہاولپور۔ نمرہ رمضان، فیصل آباد۔ سیدہ حسنہ احسان، غلام فرید، بابر نذیر، لاہور۔ فاطمہ نصیر، راولپنڈی۔ علی حسنین، بھوآنہ۔ اقراء بشیر، جھنگ۔ واہ کینٹ۔ حمزہ علی، راولپنڈی۔ رائے محمد عتیق، عفان عثمان، شیخوپورہ۔

آئیے عہد کریں

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 اپریل 2012ء ہے۔

نام ________ مقام ________

میں عہد کرتا / کرتی ہوں کہ ________

____

____

ابا جی کی الماری

سائرہ غفار

چھوٹے سے کچے صحن میں کبوتر غٹرغوں کرتے، چڑیاں چوں چوں کرتیں اور کوے کائیں کائیں کرتے اترتے اور چھوٹے چھوٹے مٹی کے برتنوں میں سے پانی پیتے اور دانہ چگتے۔ دائیں جانب اُوپر جانے کے لیے سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ ہر سیڑھی پر ایک ایک گملا دھرا تھا۔ ہر گملے میں خوش نما پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ صحن میں بائیں طرف کچن اور باتھ روم تھا۔ جب کہ سامنے کی طرف دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ دونوں کمروں سے پہلے چھوٹا برآمدہ تھا جو مہمانوں کے لیے بیٹھک کا کام کرتا تھا اسی لیے اس برآمدے کو دو کرسیوں اور ایک چھوٹی سی میز سے سجایا گیا تھا۔ دائیں طرف والے کمرے میں دو چارپائیوں کے درمیان ایک چھوٹی سی الماری رکھی تھی۔ جس پر پرانے وقتوں کا زنگ آلود تالا لگا رہتا تھا۔ اس الماری کو نیچے سے دیمک نے کھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ بارہ سالہ ثمائلہ اور دس سالہ تاثیر ہر وقت اس ٹوہ میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح ابا جی سے اس پرانی الماری کی چابی حاصل کی جائے اور دیکھا جائے کہ اس الماری میں کیا ہے۔

یہ الماری ابا جی کے زیرِ استعمال رہا کرتی تھی۔ اس الماری کو کسی اور کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ حتیٰ کہ امی جی کو بھی اسے ہاتھ لگانے کی ممانعت تھی۔ ابا جی کو جب بھی الماری کھولنی ہوتی تو وہ کمرے کا دروازہ بند کرتے پھر الماری کھول کر اپنا کام نمٹاتے۔ گھر کے باقی افراد کے لیے دُوسرے کمرے میں دو الماریاں موجود تھیں مگر پھر بھی تاثیر اور ثمائلہ کو تجسس رہتا کہ آخر معلوم کیا جائے کہ ابا جی کی الماری میں کیا ہے؟ ابا جی بہت غصے والے تھے۔ اس لیے وہ دونوں ان سے پوچھنے سے قاصر تھے۔

ایک دن ابا جی نے لال رنگ کا ایک کارڈ امی جی کو تھماتے ہوئے کہا:

''کل ایک دوست کی بیٹی کی شادی ہے، مجھے اس شادی میں شرکت کرنی ہے، میرا سفید شلوار سوٹ اچھی طرح استری کر دینا۔'' امی جی نے ''جی اچھا'' کہہ کر کارڈ تھام لیا۔ ثمائلہ اور تاثیر نے ایک دُوسرے کو اشارہ کیا اور دونوں برآمدے کے باہر بنے کچے صحن کی دائیں طرف موجود سیڑھیوں پر آ رکے۔ ثمائلہ نے پوچھا: تاثیر! بھیا کیا ہوا؟''

تاثیر سرگوشی کے انداز میں بولا: ''مجھے لگتا ہے کہ کل کا دن ابا جی کی الماری کا راز جاننے کے لیے بہترین دن ہے۔''

ثمائلہ نے خوف زدہ انداز میں پوچھا: ''لیکن اگر ابا جی کو پتہ چل گیا تو؟''

تاثیر نے کچھ سوچ کر کہا: ''تب کی تب دیکھی جائے گی۔ فی الحال تو یہ سوچو کہ الماری کی چابی کیسے حاصل کی جائے؟'' ثمائلہ اور تاثیر سوچنے لگے۔ اچانک تاثیر چلایا:

''وہ مارا!!!''

ثمائلہ نے بُرا منہ بناتے ہوئے کہا: ''تاثیر بھیا! کسی کو مارنا بُری بات ہے۔''

تاثیر اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے بولا: ''میں نے یہ محاورتاً کہا ہے، میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے آئیڈیا مل گیا ہے۔'' ثمائلہ نے پوچھا: ''وہ کیا بھلا؟''

تاثیر نے کہا: کان اِدھر لاؤ..... دیواروں کے بھی کان ہوتے

ہیں۔"

شائلہ نے کہا: "اب میں یہ دیوار کا کان کہاں سے لاؤں؟"
تاثیر نے اپنے سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔
"کیسی لڑکی ہو..... تم تو اُردو کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ میرا مطلب تھا کہ کوئی سن نہ لے اس لیے اپنا کان ادھر لاؤ تاکہ میں تمہارے کان میں آئیڈیا بتا سکوں۔" شائلہ نے اپنا کان تاثیر کی طرف کیا تو تاثیر نے اُسے اپنا آئیڈیا بتایا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں کمرے میں آئے۔ ابا جی اپنی الماری کی چابی اپنی چابیوں کے گچھے میں رکھتے تھے مگر وہ زنگ آلود چابی الگ تھلگ ہی دکھائی دیتی تھی اور فوراً پہچانی جاتی تھی۔ اگلے دن جب ابا جی شادی میں جانے کے لیے تیاری کرنے لگے تو دونوں ابا جی کے آس پاس منڈلانے لگے۔ ابا جی نہانے کے لیے غسل خانے کی طرف گئے تو تاثیر نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چابی گچھے سے نکال لی اور اسے اپنی جیب میں چھپا لیا۔ ابا جی نہا کر واپس آئے تو دونوں خوف زدہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگے۔ انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابا جی ان کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہے ہیں اور ابھی انہیں ڈانٹنا شروع کر دیں گے، مگر تھوڑی دیر کے بعد ہی ابا جی نے دونوں کو مسکرا کر دیکھا اور اپنی تیاری مکمل کرتے ہی باہر نکل گئے۔ ان کے باہر نکلتے ہی دونوں کی جان میں جان آئی اور وہ امی جان کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد امی جان وضو کر کے آئیں اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے بولیں: "میں نماز پڑھنے لگی ہوں، تاثیر بہن کا اور گھر کا خیال رکھنا۔" یہ سن کر تاثیر نے فرمانبرداری سے سر ہلا دیا۔ جب دونوں کو تسلی ہوگئی کہ امی جان نے نماز پڑھنا شروع کر دی ہے تو دونوں الماری کے پاس آ گئے۔ تاثیر نے تالے میں چابی گھمائی۔ زنگ آلود تالا فوراً کھل گیا۔ تاثیر اور شائلہ یک دم خوشی کے مارے کھل اٹھے۔ اچانک دروازہ کھٹکھٹائے جانے کی آواز پر دونوں چونک پڑے۔ اتنے میں امی سلام پھیر چکی تھیں۔ وہ دروازہ کھولنے گئیں۔ "کون؟"

"میں ہوں تاثیر کی اماں دروازہ کھولو۔" امی جان نے ابا جی کی آواز سن کر دروازہ کھول دیا۔ ابا جی نے اندر آتے ہوئے سلام کیا۔ امی جی نے جواب دیا تو ابا جی بتانے لگے۔

"دراصل سی این جی کی ہڑتال کے باعث پبلک ٹرانسپورٹ کافی کم ہے جس کے باعث رش زیادہ ہے۔ کافی دیر انتظار کے باوجود مجھے سواری نہ مل سکی تو میں واپس آ گیا ہوں۔"

اُدھر کمرے میں ابا جی کی الماری کے پاس کھڑے شائلہ اور تاثیر تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ابا جی اپنے کمرے میں آ پہنچے۔ اور ان دونوں کو کھلی الماری کے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ شائلہ اور تاثیر کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ ابا جی دونوں کے درمیان الماری کے بالکل سامنے آ کھڑے ہوئے اور بولے:

''میں نے اس الماری میں کون سا راز چھپا رکھا ہے تم لوگوں کو یہی بات بے چین کیے رکھتی ہے ناں؟'' شمائلہ اور تاثیر سر جھکائے کھڑے رہے۔ ابا جی نے الماری کے پٹ کھول کر ایک فائل نکالی۔ فائل کی بوسیدہ حالت بتا رہی تھی کہ وہ کافی پرانی ہے۔ فائل کے اُوپر کالے موٹے مارکر سے لکھا تھا ''عبدالباری ولد عبدالعلی'' ابا جی وہ فائل پکڑ کر سامنے بچھی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے شمائلہ اور تاثیر کو کہا:

''آؤ میرے بچو! میرے پاس آؤ۔ آج میں ایک راز سے پردہ اٹھائے دیتا ہوں۔'' شمائلہ اور تاثیر شرمندہ شرمندہ سے ابا جی کے دائیں بائیں طرف ٹک گئے۔ ابا جی فائل کھول کر ورق پلٹنے لگے ''تمہیں یاد ہے تاثیر میں نے تمہیں تیسری جماعت میں فیل ہو جانے پر بہت ڈانٹا تھا۔'' تاثیر نے فوراً سر ہلایا۔

شمائلہ فوراً بولی: ''اور ابا جی آپ تو تاثیر بھیا کو مارنے بھی والے تھے مگر پھر پتہ نہیں کیوں نہیں مارا تھا؟'' تاثیر نے شمائلہ کو آنکھیں دکھاتے ہوئے چپ رہنے کو کہا تو وہ فوراً زبان دانتوں تلے دبا کر خاموش ہو گئی۔ ابا جی ایک صفحہ پر آ کر رک گئے۔ اور بولے: ''جب میں چھوٹا تھا تو پڑھائی سے بھاگتا تھا، مگر میں نے ہمیشہ تم لوگوں کو پڑھنے کی تلقین کی ہے۔ تاثیر کے فیل ہونے پر میں نے اسے بہت زیادہ ڈانٹا تھا، لیکن جب مارنے لگا تو مجھے یاد آیا کہ بچپن میں ایک بار میں بھی فیل ہو گیا تھا پھر ابا جی نے میری اتنی پٹائی کی تھی کہ میرے سارے جسم پر نیل پڑ گئے تھے۔ اُس کے بعد میں ابا جی کے ڈر سے پڑھ تو لیتا تھا مگر میں نے کبھی دل لگا کر پڑھائی نہیں کی اور نہ ہی کبھی بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوا بس واجبی سے نمبر لے کر پاس ہو جاتا تھا۔ اب بھی جب کبھی مجھے تم لوگوں کے رزلٹ کا پتا چلتا ہے تو میں اپنے کمرے میں بند ہو کر اپنی الماری کھول کر اپنا رزلٹ کارڈ دیکھتا ہوں میں نے تہیہ کیا تھا کہ تم میں سے کسی کے نمبر میرے نمبروں سے کم آئے تو اُسے ڈانٹوں گا اور اگر ضرورت پڑی تو اپنا رزلٹ کارڈ بھی اُسے دکھاؤں گا مگر تم لوگ تو ہمیشہ مجھ سے زیادہ ہی نمبر حاصل کرتے رہے ہو۔ تم دونوں میرا مان ہو میرے بچو!'' ابا جی یہ کہتے ہوئے رو رہے تھے۔ تاثیر اور شمائلہ کی آنکھوں میں بھی آنسو چمک رہے تھے۔ تاثیر نے اپنی ننھی ننھی ہتھیلی سے ابا جی کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

''ہمیں معاف کر دیں ابا جی آئندہ ہم آپ کو بالکل تنگ نہیں کریں گے۔ ہم دل لگا کر پڑھیں گے اور مزید بہترین نمبر حاصل کریں گے۔'' شمائلہ نے بھی تاثیر کی ہاں میں ہاں ملائی: ''تاثیر بھیا ٹھیک کہہ رہے ہیں ابا جی ہم آئندہ بہت محنت کر کے اچھے نمبر لائیں گے ہم آپ کا نام روشن کریں گے۔'' ابا جی نے محبت سے دونوں کا ماتھا چوما اور دل ہی دل میں سوچا کہ اب اس پرانی دیمک زدہ الماری کو فروخت کر دینا چاہیے ویسے بھی اب اس کی ضرورت ختم ہو گئی تھی۔

نکھٹو

وقار محسن

لغت میں لفظ نکھٹو کے جتنے معنی درج ہیں چندا میاں عرف نکھٹو ان کی چلتی پھرتی تفسیر تھے یعنی سست، کاہل، نکمے ہونے کے علاوہ کچھ کماتے بھی نہ تھے۔ جب گاؤں کے دوسرے نوجوان صبح سویرے اپنے اپنے کاموں کے لیے کھیت کھلیانوں کا رخ کرتے تو نکھٹو دن چڑھے تک چادر اوڑھے خراٹے لیتے رہتے۔ اکثر بیوی کو انہیں جگانے کے لیے اُن پر پانی ڈالنا پڑتا۔ کچھ دیر پڑے پڑے انگڑائیوں کی مشق کرنے کے بعد جب دھوپ آدھی دیوار پر چڑھ جاتی تو وہ تین تین مکئی کی روٹیوں کے ساتھ پیاز اور لہسن کی چٹنی سے ناشتہ کرتے اور کافی دیر تک آئینے کے سامنے اپنی زلفیں سنوارنے کے بعد چوپال کا رخ کرتے جہاں ان جیسے چند اور نکھٹو ساتھی جمع ہوتے تھے۔

نکھٹو کو اس حال میں پہنچانے میں ان کی اماں کا بڑا ہاتھ تھا۔ ان کی بیوی نہایت محنتی، صابر اور سلیقہ مند تھی۔ وہ گھر کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد اپنا چرخہ اور روئی کی پونیاں لے کر بیٹھ جاتی اور رات گئے تک چراغ کی ٹمٹماتی روشنی میں سوت تیار کرتی جس کو بیچ کر اتنی آمدنی ہو جاتی کہ روکھی سوکھی روٹی میسر آ جاتی۔ اکثر نکھٹو کے اس نکمے پن پر میاں بیوی میں جھگڑا ہو جاتا۔ اماں کی ہمدردیاں لاڈلے پوت کے ساتھ ہوتیں اور وہ ان کے دفاع میں ڈٹ جاتی۔

"اے ہے بہو! کیوں اس معصوم کے پیچھے پڑی ہو، ابھی بچہ ہے آہستہ آہستہ سمجھ آجائے گا، رزق دینے والی تو اللہ کی ذات ہے۔"

بہر حال روز روز کی لڑائی سے تنگ آ کر ایک دن نکھٹو کی بیوی نے اعلان کر دیا۔

"دیکھو جی، اب بہت ہو گیا۔ میں کہاں تک ہلکان ہوتی رہوں گی، اگر تم نے کوئی کام کاج شروع نہ کیا تو میں بچوں کو لے کر اپنے میکے چلی جاؤں گی۔"

یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور نکھٹو نے وعدہ کیا کہ کل سے وہ کام پر جایا کریں گے۔

اگلے دن وہ صبح سویرے اٹھ گئے۔ کنویں پر جا کر نہائے۔ اجلی لنگی اور کرتہ پہن کر کام پر روانہ ہوئے۔ ان کی بیوی نے چار پراٹھے، گڑ اور ستو ایک پوٹلی میں دوپہر کے کھانے کے لیے باندھ

دیے۔

نکھٹو دن بھر کھیتوں، اور منڈیوں کے چکر لگاتے رہے، لیکن انہیں کہیں کوئی کام نہ ملا۔ دوپہر ڈھلے وہ پیپل کے ایک درخت کے نیچے ستانے بیٹھ گئے۔ پیپل کا یہ درخت صدیوں پرانا تھا۔ اس کے پیچھے بانسوں کے جھنڈوں کا گھنا جنگل تھا۔ آس پاس کے دیہاتوں میں مشہور تھا کہ اس پیپل کے درخت پر چار دیو رہتے ہیں۔ اس لئے لوگ دن کے وقت بھی ادھر جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔

نکھٹو نے اپنی پوٹلی سے پراٹھے نکالے اور زور زور سے بڑبڑانے لگے۔

"ایک کھاؤں، دو کھاؤں یا چاروں کے چاروں کھا لوں۔"

پیپل پر بیٹھے چاروں دیو نکھٹو کی یہ بات سن رہے تھے۔ نکھٹو سب سے موٹا پراٹھا نکال کر پھر بڑبڑائے۔

"اچھا پہلے اس موٹے کو ٹھکانے لگاؤں۔"

چاروں دیو اپنے موٹے ساتھی کی طرف دیکھ کر بولے۔

"لے بھائی! پہلے تیرا نمبر ہے۔"

چاروں ڈر سے کانپتے ہوئے نیچے اُترے اور سر جھکا کر نکھٹو کے سامنے کھڑے ہو کر گڑگڑائے۔

"اے آدم زاد! ہمیں مت کھاؤ۔ ہم تمہیں ایک ایسی ہنڈیا دیں گے جس میں تم جس کھانے کی چیز کی بھی خواہش کرو گے وہی چند منٹوں میں تیار ہو جائے گی۔"

پہلے تو نکھٹو گھبرائے پھر اپنے حواس درست کر کے بولے۔

"چلو تمہیں چھوڑ دیتا ہوں، لاؤ وہ جادو کی ہنڈیا۔"

نکھٹو نے اسی وقت ہنڈیا دو پتھروں کے درمیان رکھ کر اس کا ڈھکن ہٹا دیا اور بولے۔

"بریانی حاضر ہو۔" ایک دم سے چاروں طرف بریانی کی مہک پھیل گئی۔ پھر نکھٹو نے ڈٹ کر بریانی کھائی اور ہنڈیا تھیلے میں رکھ کر گھر کی راہ لی۔

رات ہونے پر نکھٹو راستے میں ایک سرائے میں ٹھہر گئے تھے۔ کیوں کہ وہ سیدھے سادے آدمی تھے اس لئے سونے سے پہلے سرائے کے مالک سے باتیں کرتے ہوئے انہوں نے جادو کی ہنڈیا کا بھی ذکر کر دیا۔ سرائے کا مالک شاطر انسان تھا اس نے چپکے سے رات کو ہنڈیا بدل دی۔ اگلے دن جب نکھٹو گھر پہنچے تو بیوی نے ان کو خالی ہاتھ دیکھ کر جھاڑ پلائی۔

"آ گئے میاں نکھٹو خالی ہاتھ۔"

نکھٹو نے مسکراتے ہوئے تھیلے میں سے ہنڈیا نکالی اور چولھے پر رکھ کر بولے۔

"ہاں بھئی، بتاؤ کیا کھانا ہے؟" پہلے تو سب حیران ہوئے پھر سب نے اپنی اپنی فرمائش بتانا شروع کر دی۔ نکھٹو ہنڈیا کے اُوپر جھک کر بولے۔

"قورمہ تیار ہو۔"

جب انہوں نے مسکراتے ہوئے ڈھکن کھولا تو ہنڈیا خالی تھی۔ ان کا سر شرمندگی سے جھک گیا۔ اُس رات سب بھوکے سوئے۔

اگلے دن جب نکھٹو نے کام پر جانے سے پہلے پھر چار پراٹھوں کی فرمائش کی تو ان کی بیوی ان پر برس پڑی۔

"ارے روز تم پراٹھے کھا کر آ جاتے ہو اور کام کچھ کرتے نہیں ہو۔"

بیوی کی خوشامد کے بعد ان کو پراٹھے نصیب ہوئے۔ دوپہر ڈھلے وہ پیپل کے درخت کے نیچے پراٹھے سامنے رکھ کر بیٹھ گئے اور آج انہوں نے کڑک دار آواز میں کہا۔

"آج تو نہیں چھوڑوں گا۔ آج تو چاروں کو چبا چبا کر کھا جاؤں گا۔"

چاروں دیو پھر ہاتھ جوڑے نمودار ہوئے، اُن کو دیکھتے ہی نکھٹو برس پڑے۔

"مجھے معلوم نہ تھا کہ دیو بھی انسانوں کی طرح جھوٹ بولتے اور دھوکا دیتے ہیں۔ تم نے مجھے عام ہنڈیا دے کر الو بنایا۔ میں تم چاروں کو نہیں چھوڑوں گا۔" موٹے دیو نے کہا۔

"حضور آپ کو کسی نے دھوکا دے کر ہنڈیا بدل دی ورنہ وہ سچ مچ جادو کی ہنڈیا تھی۔ ہم آپ کو ایک جادو کا ڈنڈا دیتے ہیں۔ جب

اس کو حکم دیں گے "گرہ ہو جا شروع" تو یہ دشمن پر پل پڑے گا اور وہ سچ سچ ہر بات قبول کرے گا۔ آپ کو جس پر شبہ ہے اس پر اس ڈنڈے کو آزمائیں۔"

ٹھکو کو شبہ تھا کہ یہ حرکت سرائے کے مالک ہی کی ہے۔ وہ واپسی پر اسی سرائے میں ٹھہرے اور باتوں باتوں میں جھوٹ موٹ سرائے کے مالک سے کہہ دیا کہ میرے تھیلے میں ایک ایسا پتھر ہے جسے کسی بھی چیز پر رگڑا جائے تو وہ چیز سونے کی بن جاتی ہے۔

رات کو جب وہ سونے کے لئے لیٹ گئے تو کچھ دیر بعد سرائے کا مالک کھڑکی کے ذریعے اندر آیا اور ان کا تھیلا ٹٹولنے لگا۔ ٹھکو قریب [illegible] ڈنڈے سے چپکے سے بولے۔

"گرہ ہو جا شروع"۔ اتنا سنتے ہی ڈنڈا گھومنا شروع ہو گیا اور سرائے کے مالک پر پل پڑا۔ وہ درد سے کراہ کر بولا۔

"مجھے معاف کر دو۔ میں اصلی ہنڈیا واپس کرتا ہوں جو میں نے بدلی تھی۔"

ٹھکو نے ہاتھ کے اشارے سے ڈنڈے کو رکنے کا حکم دیا۔

سرائے کے مالک نے جادو کی ہنڈیا ٹھکو کے حوالے کی اور وہ خوشی خوشی [illegible] کی طرف روانہ ہوئے۔

اگلے دن جب انہوں نے سب خاندان والوں کو مدعو کر کے دسترخوان پر بٹھا دیا اور بیوی سے خالی ہنڈیا چولھے پر رکھنے کو کہا تو اس نے غصے سے کہا۔

"آج یقیناً تم پھر سب کے سامنے میری ناک کٹواؤ گے۔ میں تنگ آ گئی ہوں روز روز کے اس ڈرامے سے۔"

"بیگم! اب پہلی مرتبہ کی طرح نہ ہوگا، یہ اصل جادو کی ہنڈیا ہے۔ میں ابھی اپنی بات کو سچ ثابت کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے کہا۔

"بریانی تیار ہو" تو دوسرے لمحے پورا گھر بریانی کی خوش بو سے مہک اٹھا۔ بریانی ایک برتن میں ڈال کر پھر حکم دیا: "قورمہ تیار ہو" فوراً قورمہ تیار تھا۔ سب مہمانوں نے سیر ہو کر مزے مزے کے کھانے کھائے۔

کچھ عرصہ بعد ٹھکو نے شہر میں 'ہانڈی دربار ہوٹل' کھول لیا جس کے کھانوں کی دھوم اب دور دور تک ہے۔

☆......☆......☆

مداوا

جدون ادیب

بابا مہربان پریم نگر کے سب سے پیارے انسان تھے۔ وہ سراپا پیار تھے۔ وہ اپنی رحم دلی، ہمدردی اور خداترسی کے باعث پریم نگر کے رہنے والوں کے دلوں میں بستے تھے۔ انہوں نے ساری عمر گاؤں والوں کی خدمت میں صرف کی تھی اور اب عمر کے آخری حصے میں بھی دوسروں کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ کوئی غمی خوشی، شادی بیاہ اُن کے بغیر ادھورا رہتا تھا۔ کوئی بھی جھگڑا یا تنازعہ جب حد سے بڑھ جاتا اور اس کا فیصلہ نہ ہو پاتا تو اسے نمٹانے کے لیے بابا مہربان کے پاس لایا جاتا اور وہ اپنی عقل مندی اور فراست سے ایسا فیصلہ کرتے کہ فریق راضی اور خوش ہو جاتے تھے۔ بابا مہربان کی عمر اسی برس ہو چکی تھی مگر وہ جوانوں کی طرح مستعد نظر آتے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک نور سا نظر آتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ ان کی نیکیوں کا صلہ ہے اور بعض لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں اپنی والدہ کی دُعا ہے۔ گاؤں کے دُوسرے بزرگ بتاتے تھے کہ بابا مہربان نے اپنی والدہ کی بہت خدمت کی تھی اور ان کی خاطر بہت قربانی دی تھی اور اُن کی والدہ کے لبوں پر مرتے دم بھی اُن کے لیے دُعائیں تھیں۔ کہتے ہیں کہ نیکی انسان کی عمر بڑھاتی ہے۔ بابا مہربان کو دیکھ کر اس بات پر یقین آ جاتا تھا۔ وہ گاؤں کے سب سے معمر آدمی تھے اور ان کے سامنے تیسری نسل جوان ہو رہی تھی۔

بابا مہربان مالٹوں کے ایک باغ کے مالک تھے۔ باغ سے انہیں اتنی آمدن ہو جاتی تھی کہ وہ کسی کے محتاج نہ تھے۔ وہ اسی آمدن سے دُوسروں کی مدد بھی کرتے تھے۔ وہ چند موثر دیسی نسخوں سے واقف تھے جن کی مدد سے وہ مریضوں کا علاج کرتے تھے اور غریب مریضوں کو اپنے پاس سے زادِراہ دے کر شہر بھی بھجواتے تھے۔ ان کا ڈیرا سب کے لیے کھلا رہتا تھا مگر مغرب کے بعد وہ صرف بزرگوں کے ساتھ محفل جمانا پسند کرتے تھے۔ جب سب اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تو وہ عشاء کی نماز پڑھ کر سو جاتے اور پھر تہجد کی نماز کے لیے اٹھ جاتے تھے۔ برسوں سے ان کے معمولات اسی طرح چل رہے تھے۔ ایک مرتبہ پریم نگر کے نوجوانوں کی والی بال کی ٹیم ساتھ والے گاؤں کی ٹیم سے میچ جیت کر آئی تو بابا مہربان نے خاص طور پر انہیں چائے پر مدعو کیا اور اپنے باغ کے رکھوالے خدا بخش کے گھر سے لڑکوں کے لیے سوجی کا حلوہ بنوایا۔

نوجوان لڑکے اس عزت افزائی پر بہت خوش ہوئے۔ بابا مہربان نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور ان کے ساتھ خوب گھل مل گئے۔ بابا مہربان بہت پیارے انسان تھے، ان کا احترام بھی بہت کیا جاتا تھا، اس دن وہ نوجوانوں کے ساتھ دوستوں کی طرح گپ شپ لگا رہے تھے۔ سراج کھوجی کے نام سے مشہور تھا۔ وہ والی بال کی ٹیم کا نائب کپتان بھی تھا، اس کے دل میں نہ جانے کیا سمائی کہ اس نے بابا مہربان سے پوچھ لیا کہ اس نے اپنے بابا سے ان کے متعلق جو کہانی سنی ہے، کیا وہ سچ ہے اور وہ ان کی زبانی یہ کہانی سننا چاہتا ہے۔ بابا مہربان ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ آخر وہ بولے۔

''میرے بچو! میرے دکھ میری تنہائی کی وجہ سے ہیں، میں نے خود کو تنہا کیا مگر اس پر مجھے افسوس بھی نہیں ہے۔''

وہ چند لمحے سوچتے رہے۔ سب لڑکے ان کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ چند لمحے بعد وہ بولے: ''میری کہانی ماں کی عظمت کی کہانی ہے۔ جب میں جوان تھا اور میری شادی ہو چکی تھی تو مجھے ماں اور بیوی میں سے کسی ایک کے انتخاب کا موقع ملا تھا اور میں نے ماں کا انتخاب کیا جس کا صلہ یہ ملا کہ آج تک خدا نے میری کوئی دعا رد نہیں کی اور مجھے پریم نگر کے لوگوں کی محبت سے نوازا ہے۔''

وہ چند لمحے کے لیے رکے۔ پھر نوجوانوں کو بغور دیکھتے ہوئے بولے: ''میری شادی کے دو ماہ بعد میری اہلیہ نے میری والدہ کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ میں شہر چلوں۔ میں نے اُسے لاکھ سمجھایا کہ میری والدہ کا میرے سوا کوئی نہیں ہے مگر وہ نہ مانی، اس کی والدہ اور گھر والوں نے بھی اُسے خوب سمجھایا مگر وہ نہ مانی اور روٹھ کر میکے چلی گئی۔ میں منانے گیا تو بولی کہ اپنی والدہ کو چھوڑ دیں۔ بات بڑھ گئی۔ میری والدہ نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنا وقت گزار چکی ہیں۔ میں اپنی اہلیہ کو لے آؤں مگر

میں نے انکار کر دیا۔ کچھ دن اور گزرے تو میری والدہ کی طبیعت خراب ہو گئی اور کچھ دن بیمار رہ کر ان کا انتقال ہو گیا۔ میری اہلیہ ان کے جنازے میں بھی نہیں آئی۔ پتا چلا کہ وہ لوگ شہر سے چلے گئے ہیں۔ والدہ کے انتقال کے بعد میں سعودی عرب چلا گیا اور دس سال کے بعد واپس آیا۔ دوستوں نے زور دیا کہ دُوسری شادی کر لوں مگر میں نے انکار کر دیا اور پھر جیسے تیسے زندگی آخر گزر ہی گئی۔ اب کبھی کبھار سوچتا ہوں کہ کاش شادی کر لیتا یا میری اہلیہ ناراضگی ختم کر دیتیں تو میری بھی اولاد ہوتی۔ میرے مرنے کے بعد میرے نام لیوا تو ہوتے......"

بابا مہربان کی آواز بھرا گئی مگر پھر انہوں نے خود پر قابو پایا اور بولے: "مگر بچو! آج تمہاری محبت پا کر مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔ تم سب میرے بچے ہو!"

"ہاں بابا! سب آپ کے بچے ہیں!" شریف بولا۔

کھوجی گہری سوچ میں گم تھا۔ وہ بہت غور سے بابا مہربان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی اس غور و فکر والی عادت کی وجہ سے سب اسے کھوجی کہتے تھے۔ اس وقت مغرب کی اذان ہوئی تو بابا مہربان نے اٹھتے ہوئے کہا: "بچو! اب تم لوگ جاؤ۔ نماز پڑھو۔ میں بھی نماز پڑھوں گا۔ میرے دوست بھی آتے ہی ہوں گے۔"

سب لڑکے ادب سے سلام کر کے چلے گئے۔

والی بال ٹیم کے لڑکوں نے بابا مہربان کی دعوت کو کچھ دن یاد رکھا پھر بھول گئے مگر سراج نہیں بھولا تھا۔ اسے ایک بات کی کھوج تھی۔ پھر وہ دو دن کے لیے کہیں چلا گیا۔ جب تیسرے دن وہ لوٹا تو بہت خوش تھا مگر خوشی کا راز کسی کو نہیں بتایا۔ وہ دوپہر کے وقت بابا مہربان کے پاس گیا تو پتا چلا کہ وہ بیمار ہیں اور ان کی عیادت کو لوگ دُور دُور سے آ رہے ہیں۔ اس نے بھی بابا کا حال پوچھا۔ وہ بہت تھکے تھکے اور پژمردہ لگ رہے تھے۔ تب سراج نے انہیں یہ بتا کر حیران کر دیا کہ شام تک ان سے ملنے کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ جو ان کے رشتے دار ہیں۔

بابا مہربان یہ سن کر بہت حیران ہوئے اور ان کے پوچھنے پر بھی سراج نے انہیں نہیں بتایا کہ وہ کون لوگ ہیں، ہاں یہ ضرور کہا کہ وہ انہیں ایک بڑی خوشی دینا چاہتا ہے۔ شام ہونے والی تھی کہ گاؤں میں ایک بڑی کار میں شہر سے ایک فیملی پہنچی۔ انہوں نے سراج کا پوچھا اور وہ پھر اُس کے ساتھ سیدھے بابا مہربان کے ڈیرے پر پہنچے۔ گاؤں کے لوگ ان اجنبی لوگوں کی آمد پر بہت حیران تھے۔ وہ بھی پیچھے پیچھے وہاں پہنچ گئے۔ پھر لوگوں نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر آدمی بابا کے پیروں سے لپٹا رو رہا ہے۔ دو کم سن لڑکے اور ایک نوجوان لڑکی بابا مہربان کے ہاتھوں کو چوم رہے ہیں۔ ادھیڑ عمر ایک خاتون بھی وہاں کھڑی

آنسو بہا رہی تھی۔

بابا مہربان خود بھی رو رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں سب کو پتا چل گیا کہ ادھیڑ عمر آدمی کامران، بابا مہربان کے بیٹے ہیں۔ دونوں لڑکے اور بچی بابا مہربان کے پوتے پوتی ہیں اور خاتون ان کی بہو ہے۔

سراج اچانک پریم نگر کا ہیرو بن گیا۔ اس نے بابا مہربان کو ایسی خوشی دی تھی، جس کا کوئی نعم البدل نہیں تھا۔ اس خوشی نے پریم نگر کے لوگوں کو بابا مہربان کے سامنے سرخرو کر دیا تھا۔ صدیق میراثی ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے فتے کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور اگلے لمحے ڈھول کی تیز آواز پر جشن شروع ہو گیا۔ لوگ خوشی سے ناچ رہے تھے۔ بھنگڑے ڈال رہے تھے۔ کئی گھروں میں مہمانوں کے لیے کھانے پک رہے تھے۔ ہر چہرے پر خوشی تھی۔

سراج دوستوں کے بیچ بیٹھا بتا رہا تھا کہ اس نے بابا مہربان کے خاندان کو ڈھونڈا تو پتا چلا کہ ان کی بیگم ایک بیٹے کو جنم دے کر انتقال کر گئی تھیں اور نومولود بچے کو اس کی ممانی نے گود لے لیا جن کے ہاں اولاد نہیں تھی۔ کچھ عرصے بعد وہ لوگ پریم نگر آئے تھے مگر بابا مہربان سعودی عرب گئے ہوئے تھے اس لیے ان سے رابطہ نہ ہو سکا اور پھر زندگی کے جھمیلوں میں یہ راز راز ہی رہا کہ بابا مہربان کا ایک بیٹا بھی ہے۔ پھر یہ راز تب کھلا جب سراج نے ان کا کھوج لگایا اور کامران صاحب نے اپنی ممانی سے جنہیں وہ اپنی والدہ سمجھتے تھے پوچھا تو انہوں نے سچائی بتا دی جب کامران صاحب اور ان کے بچوں کو بابا مہربان کے بارے میں پتا چلا تو وہ ان سے ملنے کے لیے بے تاب ہو گئے۔

بابا مہربان سراج کے بہت شکر گزار تھے اور ان کے لبوں پر اس کے لیے بہت سی دعائیں تھیں۔ ان کے بیٹے نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ہر چھٹی کا دن بابا مہربان کے ساتھ گزاریں گے اور گاؤں میں اپنے بچوں کے لیے مکان بنائیں گے اور ان کی تعلیم ختم ہونے کے بعد وہ گاؤں میں شفٹ ہو جائیں گے۔

مہمان تین دن گاؤں میں رہ کر جلد آنے کے وعدے پر رخصت ہوئے تو پورا گاؤں انہیں خدا حافظ کہنے کے لیے آیا۔ بابا مہربان اس خوشی کو پا کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے تھے اور اب انہیں کوئی دکھ نہیں تھا...... سراج نے کھوج لگا کر ان کے دکھ کا مداوا کر دیا تھا۔

زمزمہ توپ

لاہور عجائب گھر، پنجاب یونیورسٹی علامہ اقبال کیمپس اور نیشنل کالج آف آرٹس کے درمیان شارع قائداعظم پر ایک قدیم توپ نصب ہے۔ جسے زمزمہ توپ، بھنگی توپ یا "KIM'S GUN" کہا جاتا ہے۔ اپنے وقت کی یہ سب سے بڑی توپ تھی۔ جسے 1757ء میں لاہور کے شہریوں سے برتن مانگ کر بنایا گیا تھا۔ توپ کی لمبائی چودہ فٹ اور ساڑھے چار انچ ہے جب کہ اس کا

دھانہ ساڑھے نو انچ ہے۔ اسے وزیر اعظم شاہ ولی خاں کی ہدایت پر بنایا گیا تھا جو افغان بادشاہ احمد شاہ درانی کا وزیر تھا۔ تانبے اور پیتل کی اس توپ کو احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی لڑائی میں 1761ء میں پہلی بار استعمال کیا۔ مختلف جنگوں سے گزر کر یہ توپ گوجرانوالہ، امرتسر وغیرہ بھی پہنچی۔ یہ توپ لاہور کے گورنر خواجہ عبید کے پاس تھی کہ 1762ء میں سردار ہری سنگھ بھنگی نے حملہ کر دیا اور توپ چھین لی۔ بعد ازاں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بھنگی کو 1802ء میں شکست دی اور توپ پر قبضہ کر لیا۔ توپ مزید استعمال کے قابل نہ رہی تو اسے دہلی دروازے لاہور کے باہر نصب کر دیا گیا۔ جہاں یہ 1860ء تک رہی۔ 1866ء میں اسے لاہور عجائب گھر لایا گیا۔ بعد ازاں 1977ء میں اس کو مال روڈ لاہور پر نمائش کے لیے نصب کر دیا گیا۔ لاہور عجائب گھر میں برطانوی عہد میں ایک انگریز نوکری کرتا تھا۔ جس کے بیٹے RUDYARD KIPLING نے اپنے ناول "KIM" میں اس توپ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس لیے زمزمہ توپ کو KIM'S GUN بھی کہا جاتا ہے۔

ماچس

ماچسیں جمع کرنا ایک مشغلہ بھی ہے۔ جسے برطانوی شخص M.S.EVANS نے 1943ء میں PHILLUMENY کا نام دیا۔ یہ لاطینی حروف PHIL (جس کا مطلب ہے محبت) اور LUMEN (جس کا مطلب ہے روشنی) سے لیا گیا ہے۔ ماچس درحقیقت فرانسیسی لفظ MECHE سے لیا گیا ہے۔ جس کا مطلب
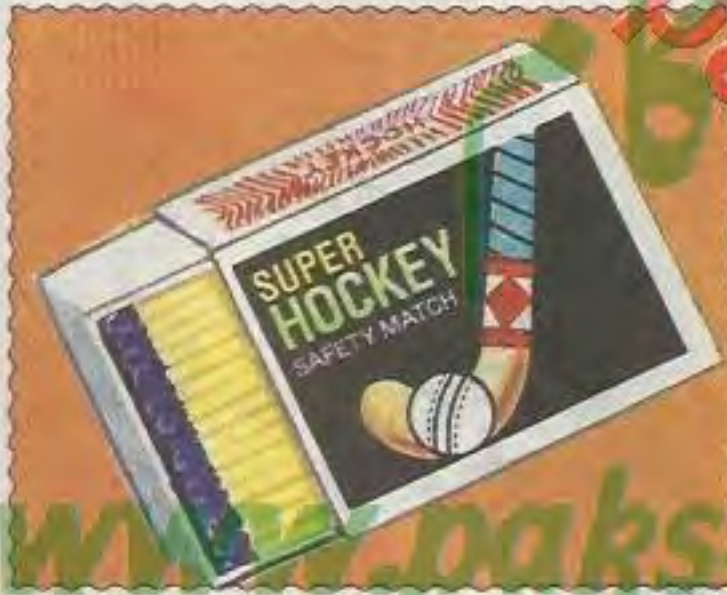
''موم بتی کا اُجالا'' ہے۔ قدیم چائنہ کے لوگ پائن کی لکڑی اور سلفر کی دیا سلائی استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح "FOMES" نامی فنگس کو رگڑ کر بھی آگ جلائی جاتی رہی ہے۔ 1805ء میں JEAN CHANCEL جو پیرس (فرانس) میں اسسٹنٹ پروفیسر کیمیا تھا اُس نے پہلی باضابطہ ماچس یا دیا سلائی بنائی۔ ماچسیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ اول سیفٹی ماچس (SAFETY) اور دُوسری کسی بھی سطح سے رگڑ کر جلنے والی ماچس۔ دیا سلائی میں پہلے سفید فاسفورس اور اب سرخ فاسفورس استعمال ہوتا ہے۔ رگڑ

والی سطح جو ماچس کی ڈبی پہ بنی ہوتی ہے۔ اس میں 50 فیصد سرخ فاسفورس اور 4 فی صد کالی کاربن وغیرہ استعمال ہوتی ہے۔ سمندروں میں جان بچانے والی کشتیوں پر نہ بجھنے والی موم بتیاں لگائی جاتی ہیں جو ہوا سے نہیں بجھتیں۔ ان میں موم اور واٹر پروف مادے کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ دراصل یہ دیا سلائی ہوتی ہے جو موم بتی کا کام کرتی ہے۔ دیا سلائی کے ایک سرے پر فاسفورس کے ساتھ GELATIN (یہ بے رنگ، بے بو مادہ ہے) لگا ہوتا ہے۔ اسے "HEAD" کہتے ہیں۔ یہ رگڑ کھا کر شعلہ پیدا کرتا ہے۔

شاپنگ بیگ

1912ء میں پہلی بار MINNESOTA کے دکان دار "W.H.DEUBNER" نے شاپر بیگ متعارف کروایا، لیکن یہ زیادہ پذیرائی حاصل نہ کر سکا۔ تاہم 1950ء کی دہائی میں سویڈن کے انجینئر نے پلاسٹک کا شاپنگ بیگ متعارف کروایا جسے انجینئر STEN GUSTAF THULIN (LIN) کی اجازت سے سویڈش کمپنی CELLOPLAST نے 1965ء میں رجسٹر کروایا۔ امریکہ میں پہلی بار 1977ء میں MOBIL کمپنی نے پلاسٹک کا شاپنگ بیگ رجسٹر کرایا۔ یہ اعزاز جارجیا کی کمپنی "DIXIE" کے سر رہا۔ تازہ ترین رپورٹ کے مطابق صرف امریکہ میں ہر سال 102 ارب شاپنگ بیگ استعمال ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے پلاسٹک کے بنے یہ بیگ سہولت کے ساتھ ساتھ ماحول کے دشمن ثابت ہوئے ہیں۔ بیکٹیریا اور فنجائی ان کو گلاتے نہیں۔ چنانچہ یہ اپنی اصلی صورت میں رہتے ہیں۔ یہ جلنے سے زہریلی گیس پیدا کرتے ہیں۔ بنگلہ دیش، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ میں پلاسٹک کے شاپنگ بیگ استعمال کرنا جرم ہے۔ اسی لیے اب کئی ممالک نے BIODEGRADABLE پلاسٹک سے شاپنگ بیگ بنانا شروع کر دیئے ہیں۔ یہ بیگ ماحول دوست ہیں۔ انہیں سبزیوں، مکئی کے آٹے، چکنائی اور MICROBIOTA نامی پودے کی مدد سے بناتے ہیں۔ یہ پودا، روس اور سائبیریا وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔

جگنو

دنیا کی ادبی تاریخ میں جگنو کو بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ اردو ادب میں اس کیڑے کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ جگنو کو انگلش میں فائر فلائی کہتے ہیں۔ یہ چمکتا ہوا کیڑا رات کو بڑا پرکشش معلوم پڑتا ہے۔ جگنو کے پیٹ کے نچلے حصے سے پیلی، سبز یا ہلکی سرخ سی روشنی نکلتی ہے۔ جس میں انفراریڈ اور الٹراوائلٹ شعاعیں نہیں ہوتیں۔ اس روشنی کی ویولینتھ (WAVE LEANGTH) 510 سے 670 نینو میٹر ہوتی ہے۔ اس کی 200 اقسام دریافت

ہو چکی ہیں۔ یہ کیڑا سرسبز، ٹھنڈے اور نمی والے مقامات پر رہنا پسند کرتا ہے۔ کچھ اقسام کے لاروے بھی روشنی خارج کرتے ہیں۔ اکثر جگنو اڑتے ہیں جب کہ کچھ اقسام میں مادہ جگنو نہیں اڑتی۔ یہ کیڑے اکثر رات کو باہر نکلتے ہیں۔ مادہ جگنو انڈے مئی کے مہینے میں دیتی ہے۔ جن میں سے 3 سے 4 ہفتوں میں بچے نکل آتے ہیں۔ عموماً موسم گرما کے دوران بچے انڈوں سے نکل آتے ہیں۔

ٹیبل

استاد (طالب علم سے): ''کل میں نے کہا تھا کہ تم ٹیبل یاد کر کے آنا، کیا ٹیبل یاد کر کے آئے ہو؟''

طالب علم: ''جی سر! میں نے ٹیبل یاد کر لیے ہیں۔''

استاد: ''تو پھر سناؤ ٹیبل۔''

طالب علم: ''ڈائننگ ٹیبل، ڈریسنگ ٹیبل، ٹائم ٹیبل۔''

(نمرہ رمضان، فیصل آباد)

دھکا

ایک آدمی اپنے کان میں چابی کی مدد سے خارش کر رہا تھا کہ ایک آدمی اُسے ایسا کرتے دیکھ کر بولا۔

''بھائی جان! اگر آپ سٹارٹ نہیں ہو رہے تو میں دھکا دوں؟''

(حافظ محمد عزت اللہ، چیچہ وطنی)

دو بے وقوف

ایک بے وقوف (دوسرے بے وقوف سے): ''دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟''

دوسرا بے وقوف: ''تمہیں معلوم ہے کہ میں معاشرتی علم میں کمزور ہوں۔''

پہلا بے وقوف: ''میں نے اسی لیے تم سے اسلامیات کا سوال پوچھا ہے۔''

(محمد عبداللہ، لاہور)

محنت

باپ (بیٹے سے): ''غم نہ کرو تمہاری تقدیر میں فیل ہونا لکھا تھا اس لیے تم فیل ہو گئے۔''

بیٹا: ''تو اچھا ہوا کہ میں نے محنت نہیں کی ورنہ ساری محنت بے کار چلی جاتی۔''

(تحریم فاطمہ، لاہور)

علاج

مریض (حکیم صاحب سے): ''مجھے کھانے کے بعد بھوک نہیں لگتی، سونے کے بعد نیند نہیں آتی اور کام کرنے کے بعد تھک جاتا ہوں۔''

حکیم صاحب نے کہا: ''تم ساری رات دھوپ میں بیٹھو، ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

(سکندر اقبال، کراچی)

دم

ایک موٹی عورت کے گھر میں چور گھس آیا۔ اس عورت نے چور کو پیچھے سے دھکا دیا اور اس کی کمر پر بیٹھ کر اپنے نوکر سے بولی۔

''جلدی سے پولیس کو بلاؤ۔''

نوکر گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آ کر کہنے لگا: ''مالکن! میری چپل نہیں مل رہی۔''

چور جھٹ سے بولا: ''ارے میری چپل پہن جاؤ، جلدی کرو، میرا تو دم نکلا جا رہا ہے۔''

(چوہدری محمد عثمان، ٹیکسلا)

رکشے والا

مسافر: ''اسٹیشن جانے کے کتنے پیسے لو گے؟''

رکشے والا: ''پچاس روپے۔''

مسافر: ''بیس روپے لے لو۔''

رکشے والا: ''بیس روپے میں کون آپ کو اسٹیشن لے جائے گا؟''

مسافر: ''تم پیچھے بیٹھو، میں لے کر جاؤں گا۔''

(سدرہ بتول، راولپنڈی)

عام آدمی

نفسیات کا ڈاکٹر اپنے مریض سے: ''اب آپ بالکل صحت یاب ہو چکے ہیں۔ آپ کو کیسا محسوس ہو رہا ہے؟''

مریض: ''بہت بُرا لگ رہا ہے۔''

ڈاکٹر: ''وہ کیوں؟''

مریض: ''علاج سے پہلے میں فرانس کا بادشاہ تھا اور اب ایک عام آدمی ہوں۔''

(اویس شوکت، فیصل آباد)

رنگ برنگے طوطے

مُنے میاں کل چھٹی کے دن چڑیا گھر جا پہنچے
وہاں انہوں نے رنگ برنگے بچو طوطے دیکھے
آزادی سے اڑنے والے قید میں تھے بے چارے
چھوٹے بڑے لوہے کے پنجروں میں تھے طوطے سارے
دیکھے جنوبی امریکا اور افریقہ کے طوطے
دلکش دلکش پیارے پیارے نئے نویلے طوطے
پنجروں میں کچھ اڑتے ہوئے لگتے تھے پیارے طوطے
بیٹھے ہوئے بھی اڑ جاتے تھے پا کے اشارے طوطے
پنجروں ہی میں جُھولے تھے، وہ ان میں جھولتے جھولا
جس نے دیکھے ایسے لمحے پھر نہ کبھی وہ بھولا
دُنیا بھر میں طوطوں کی ہیں بہت سی بچو قسمیں
چڑیا گھر میں ان طوطوں کو آپ بھی جا کر دیکھیں
اپنے اپنے گھروں میں بچے شوق سے پالیں طوطے
پھل وہ لا کر ان کو کھلائیں دیکھو مزے مزے کے
لاکھ کھلاؤ، پیار سے پالو ان طوطوں کو بچو!
موقع ملتے ہی اُڑ جائیں طوطا چشم ہیں دیکھو
اُس خالق کے قرباں ہیں ہم جس نے انہیں بنایا
ضیا اُسی نے ہر اک شے سے دُنیا بھر کو سجایا

ضیاء الحسن ضیا

چچا تیز گام نے پینٹ کیا

محمد فہیم عالم

چچا تیز گام جیسے ہی ایک چبوترے کی طرف بڑھے چبوترے پر بیٹھے کئی مزدور تیر کی طرح اُن کی طرف لپکے اور چچا تیز گام کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کچھ ہی دیر میں ان کے گرد اچھا خاصا رش لگ گیا۔

"اے بھائی...... رُکو...... رُکو۔ ذرا سانس تو لینے دو۔"

چچا تیز گام اس اچانک افتاد پر گھبرا سے گئے۔

"میاں صاحب! آپ سانس بعد میں لیجیے گا، پہلے کام بتایئے کام، راج گیری، اینٹیں اٹھانا، ریت اٹھانا اور ماربل لگوانا، غرض جو بھی کام آپ کروانا چاہیں بندہ ہر فن مولا ہے۔" ایک دبلا پتلا آدمی اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔

"لیکن مجھے ہر فن مولا نہیں صرف ایک فن مولا چاہیے۔ اور وہ فن ہے پینٹ کرنا۔" چچا تیز گام بولے۔

"اوہ......" چچا تیز گام کی یہ بات سن کر بہت سے چہروں پر اداسی چھا گئی۔ کچھ دیر پہلے جو مزدور شہد کی مکھیوں کی طرح چچا تیز گام کو چمٹ گئے تھے وہ فوراً وہاں سے چلے گئے۔ اب وہاں صرف ایک ہی آدمی رہ گیا تھا۔

"جی صاحب! کیا پینٹ کروانا ہے؟" وہ برش چچا تیز گام کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے ایسے بولا جیسے چچا تیز گام نے گھر نہیں اپنا چہرہ پینٹ کروانا ہو

"صرف ایک کمرے میں پینٹ کروانا ہے، بتاؤ کتنے پیسے لوگے؟"

"ویسے تو میں ایک کمرے میں پینٹ کرنے کے دو ہزار روپے سے کم نہیں لیتا لیکن آپ سے صرف پندرہ سو روپے لے لوں گا۔" وہ گویا چچا تیز گام پر احسان جتلاتے ہوئے بولا۔

"کیا کہا......؟" دو ہزار روپے۔ چچا تیز گام اتنے روپوں کا سن کر چلا اٹھے۔

"اماں جاؤ...... دو ہزار تو تم نے ایسے کہا ہے جیسے روپے درختوں پر اُگتے ہیں، میں تو صرف پانچ سو روپے دوں گا۔ کام کرنا ہے تو بتاؤ ورنہ اپنا راستہ ناپو۔" چچا تیز گام نے کہا۔

"پانچ سو روپے...... بڑے میاں کس زمانے کی بات کرتے ہو۔ وہ زمانہ گیا جب ایک روپے کی بکری اور تین چار روپے کی بھینس آ جاتی تھی۔ میں تو پندرہ سو روپے سے ایک پیسہ بھی کم نہ لوں گا۔ اگر کام کروانا ہے تو میں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار

ہوں۔ اور ہاں یہ آپ نے کیا کہا کہ میں اپنا راستہ ناپوں، بڑے میاں راستہ تو آپ کو ناپنا پڑے گا کیوں کہ اس وقت یہاں میرے علاوہ کوئی اور پینٹ کرنے والا نہیں ہے۔'' وہ چچا تیز گام کو گھورتے ہوئے بولا۔

''لیکن میں تو پانچ سو روپے سے ایک پیسہ بھی زیادہ نہیں دوں گا۔'' چچا تیز گام بھی اڑ گئے۔

''تو پھر آپ کو اپنے کمرے میں پینٹ خود ہی کرنا پڑے گا کیوں کہ اتنے کم روپوں میں تو کوئی کمرہ تو کیا ایک دیوار پر بھی پینٹ نہیں کرے گا۔'' وہ جل بھن کر بولا۔

''واہ بھئی واہ کیا بات کہہ دی۔ واقعی پینٹ تو ہم خود بھی کر سکتے ہیں۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم خود پینٹ کریں گے۔'' چچا تیز گام خود کلامی کرتے ہوئے بولے۔ اور تیزی سے پینٹ کی دُکان کی طرف بڑھے۔

چچا تیز گام کے کمرے کا پینٹ جگہ جگہ سے اکھڑ گیا تھا۔ بیگم ان سے کئی مرتبہ کہہ چکی تھی کہ اپنے کمرے میں پینٹ کروا لیں، لیکن وہ چچا تیز گام ہی کیا جو ایک بار کا کہا مان لیں۔ وہ اتوار کا دن تھا۔ بیگم، بچوں کے ساتھ اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ چچا تیز گام کے دل میں نہ جانے کیا آئی۔ پینٹ کروانے کے لیے پینٹر کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، لیکن زیادہ پیسوں کا سن کر انہوں نے خود ہی پینٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

پھر چچا تیز گام پینٹ لے کر آ گئے۔

''جمن...... او جمن...... استاد'' چچا تیز گام نے پکارا۔

''جی مالک ابھی آیا مالک......'' دونوں دوڑتے ہوئے آئے۔

''جی مالک کے بچو! جاؤ ہمارے کمرے سے سامان باہر نکالو۔ ہم پینٹ کریں گے۔'' چچا تیز گام بولے۔

''مالک آپ پینٹ کریں گے؟'' جمن نے حیرت کا اظہار کیا۔

''کیا ہم پینٹ نہیں کر سکتے؟'' چچا تیز گام نے آنکھیں نکالیں۔

''نہیں مالک! آپ...... تو سب کچھ کر سکتے ہیں۔'' جمن گھبرا کر بولا۔

''خیر یہ بات بھی نہیں، جاؤ تم جا کر کمرے سے سامان نکالو ہم پینٹ بناتے ہیں۔ اور استاد تم باورچی خانے سے جا کر چھری اور مٹی کا تیل لے آؤ......'' چچا تیز گام کی بات سن کر دونوں وہاں سے چلے گئے۔

''مالک! چُھری تو مل گئی ہے۔ لیکن مٹی کا تیل نہیں مل رہا۔'' کچھ دیر بعد استاد کی واپسی ہوئی۔

''تمہیں کوئی چیز کبھی ملی بھی ہے۔ تم پینٹ کے ڈبے کا ڈھکن کھولو ہم مٹی کا تیل ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔'' چچا تیز گام غصے سے بولے۔ کافی تلاش کے بعد چچا تیز گام کو باورچی خانے میں مٹی کا تیل مل ہی گیا۔

''یہ لو، ڈھونڈ لیا ہم نے مٹی کا تیل۔'' چچا تیز گام مٹی کے تیل کی بوتل استاد کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے بولے۔

''مالک...... یہ مٹی کا تیل ہے......؟'' استاد حیرت سے بوتل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اور نہیں تو کیا، چلو اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ اسے پینٹ میں ڈال کر خوب ملاؤ۔'' استاد نے بے چارگی سے ایک نظر مٹی کے تیل کی بوتل کی طرف اور ایک نظر چچا تیز گام کی طرف دیکھا پھر وہ مٹی کے تیل کو پینٹ میں ملانے لگا۔

''بس کرو، تم نکال چکے سامان...... ہمیں پینٹ کرنے دو۔''

چچا تیز گام کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔ کمرے سے بھاری بھرکم سامان نکالتے نکالتے جمن کا بھرکس نکل گیا تھا۔

''لیکن مالک...... وہ......'' جمن نے کہنا چاہا۔

''کیا لیکن، جاؤ سیڑھی لے کر آؤ۔'' چچا تیز گام پینٹ کرنے کے لیے کچھ زیادہ ہی بے چین دکھائی دیتے تھے۔ کچھ دیر بعد جمن سیڑھی لے آیا۔

ایک ہاتھ میں پینٹ کی بالٹی اور دُوسرے ہاتھ میں پینٹ کرنے والا برش پکڑے چچا تیز گام سیڑھی پر چڑھنے لگے۔ ان کے دونوں ہاتھوں میں چیزیں تھیں، اس لیے وہ سیڑھی کیسے پکڑتے۔ لہٰذا ابھی وہ دو تین سیڑھیاں ہی چڑھ پائے تھے کہ توازن برقرار نہ رکھ سکے اور پینٹ کی بالٹی سمیت زمین پر آ گرے۔ پینٹ چچا تیز گام کے چہرے اور کپڑوں پر گرا اور ان کے کپڑوں اور چہرے

پر عجیب و غریب نقش و نگار بن گئے۔

''کم بختو! تم کوئی ایک چیز ہم سے پکڑ نہیں سکتے تھے۔ سارا پینٹ گرا دیا۔'' چچا تیز گام جمن اور استاد پر برس پڑے۔

''اب یوں ٹکر ٹکر ہمارا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ پینٹ کی بالٹی پکڑو۔ جب ہم اوپر پہنچ جائیں تو ہمیں پینٹ کی بالٹی پکڑانا۔'' چچا تیز گام غصے سے بولے اور ایک بار پھر سیڑھی پر چڑھنے لگے۔ جمن نے ان کو پینٹ کی بالٹی پکڑا دی۔ چچا تیز گام نے برش بالٹی میں ڈبویا اور دیوار پر پینٹ کرنے لگے۔ جلدی میں انہوں نے اپنے چہرے سے پینٹ بھی صاف نہیں کیا تھا۔

''ارے...... یہ کیا...... یہ پینٹ تو بہت گاڑھا ہے۔ یہ پتلا کس طرح ہوگا؟'' چچا تیز گام بولے۔ انہوں نے کئی مرتبہ برش کو دیوار پر پھیرا لیکن دیوار پہ پینٹ لگ ہی نہیں رہا تھا۔

''اوہ...... اب ہم سمجھے۔ یہ پینٹ دیوار پر کیوں نہیں لگ رہا۔ جمن، استاد...... جاؤ...... جلدی سے ریگ مال لے کر آؤ اور دیوار کو اچھی طرح صاف کرو، پہلے پینٹ کے ہوتے ہوئے دوسرا پینٹ بھلا کس طرح دیوار پر ٹھہر سکتا ہے۔'' چچا تیز گام بولے۔

جمن اور استاد چچا تیز گام کے سامنے مجبور تھے۔ کسی نہ کسی طرح دونوں نے کمرے کی دیواروں اور چھت سے پینٹ کسی نہ کسی طرح کر صاف کیا۔ چچا تیز گام اس دوران مسلسل ان کی نگرانی کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد چچا تیز گام دوبارہ پینٹ کرنے لگے، مگر اس مرتبہ بھی پینٹ دیوار پر نہ لگا۔

''مالک! آپ نے پینٹ میں مٹی کا تیل ملایا تھا؟'' جمن نے پوچھا۔

''نہیں...... مالک نے تیل نہیں بلکہ چینی کا شیرہ ملایا تھا۔ استاد بولا تھا۔''

''کیا!!!......'' چچا تیز گام چلا اٹھے۔'' تو کیا وہ چینی کا شیرہ تھا، کم بخت تم نے پہلے مجھے کیوں نہیں بتایا۔''

''مالک! میں تو بتانے لگا تھا، لیکن آپ نے سنا ہی نہیں۔'' استاد برا سا منہ بنا کر بولا۔

''اب زیادہ باتیں نہ بناؤ جاؤ جا کر مٹی کا تیل لے کر آؤ۔''

چچا تیز گام جھنجلا کر بولے۔ استاد بھاگ کر بازار سے مٹی کا تیل لے آیا۔ مٹی کا تیل ملا کر چچا تیز گام پینٹ کرنے لگے تو پینٹ دیوار پر چپکنے لگا۔

''یہ ہوئی نا بات! اب آئے گا مزہ۔'' چچا تیز گام پینٹ کرتے ہوئے بولے۔ کافی پینٹ تو پہلے ہی گر چکا تھا۔ اس لیے کچھ ہی دیر بعد پینٹ ختم ہو گیا اور چچا تیز گام ویسے بھی برش کو خوب ڈبو ڈبو کر پینٹ کر رہے تھے۔ برش سے بہت سا پینٹ ان کی شیروانی اور ٹوپی کو بھی لگ گیا تھا۔ چچا تیز گام استاد سے مزید پینٹ منگوانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ بیگم میکے سے آ گئیں۔

''یہ...... یہ...... کیا ہے؟'' کمرے اور چچا تیز گام کی حالت دیکھ کر بیگم چلائیں۔ کمرہ کباڑخانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔

''یہ پینٹ کیا ہے ہم نے۔ تم کئی دنوں سے پینٹ کروانے کا کہہ رہی تھیں نا تو بس ہم نے خود ہی پینٹ کر دیا ہے۔'' چچا تیز گام فخر سے بولے۔

''لیکن میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم خود ہی پینٹ کرنے لگ جاؤ۔'' بیگم جل بھن کر بولیں۔

''پینٹ کرنے والا آدمی تو بہت زیادہ روپے مانگ رہا تھا۔ میں نے سوچا خود ہی پینٹ کر لیتا ہوں، پینٹ ختم ہو گیا ہے، استاد جاؤ اور پینٹ......'' بیگم ان کی بات کاٹتے ہوئے بولی: ''بس بس بہت ہو گیا پینٹ۔ کل کسی رنگ ساز کو بلا کر پینٹ کروائیں گے۔ اور یہ...... یہ کیا ہے؟'' بیگم کچھ کہتے کہتے اچانک رک گئیں۔ اور دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔ دیوار پر جہاں چچا تیز گام نے پینٹ کیا تھا۔ وہاں بے شمار مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ چچا تیز گام کی ٹوپی اور شیروانی پر بہت سی مکھیاں بیٹھی تھیں۔

''بیگم صاحبہ! مالک نے پینٹ میں شیرہ ملایا تھا۔ یہ سب اسی شیرے کی کارستانی ہے۔'' استاد بول اٹھا۔

''پینٹ میں شیرہ......؟'' بیگم نے حیرت سے کہا تو استاد فوراً تمام قصہ سنانے لگا۔ جب کہ چچا تیز گام مسکی صورت بنائے دیوار پر بھنبھناتی مکھیوں کو تک رہے تھے۔

☆......☆......☆

میری زندگی کے مقاصد

محمد اکبر عرفان، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

میمونہ لیاقت، لیاقت پور
میں بڑی ہو کر سائنس دان بن کر پاکستان کا نام روشن کروں گی۔

حمزہ علی، راول پنڈی
میں بڑا ہو کر کمپیوٹر انجینئر بن کر پاک وطن کو ترقی کی راہ پر گامزن کروں گا۔

محمد حمزہ، اسلام آباد
میں بڑا ہو کر فوجی بننا چاہتا ہوں اور اپنے پیارے وطن کی سرحدوں کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔

زوار حیدر، گوجرانوالہ
میں بڑا ہو کر سائنس دان بن کر اپنے ملک کا نام روشن کروں گا۔

اریبہ لیاقت، لیاقت پور
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بن کر غریب لوگوں کا مفت علاج کروں گی۔

سمیعہ اسحاق ہاشمی، واہ کینٹ
میں پائلٹ بن کر ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔

علی رضا، نوشہرہ
میں پاک فوج میں جا کر اپنے پیارے وطن کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔

سید علی رضا واسطی، لاہور
میں پولیس آفیسر بن کر ارضِ پاکستان سے جرائم کو ختم کروں گا۔

[illegible]، راول پنڈی
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

آسیہ فاطمہ، سیال کوٹ
میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔

کامران اللہ خٹک، کرک
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

سیدہ ماہین زہرا، جھنگ
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کے لیے ایک بڑا اسپتال بناؤں گی۔

محمد قمر دین طاہر، راول پنڈی
میں ڈاکٹر بن کر اپنے ملک کا نام روشن کرنا چاہتا ہوں۔

محمد [illegible]، میاں والی
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا اور اپنے ملک کا نام روشن کروں گا۔

محمد برہان مرزا، لاہور
میں بڑا ہو کر سیاست دان بن کر ملک کی تقدیر بدل دوں گی۔

شاہ گان خان، کراچی
میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے والدین کا نام روشن کروں گا۔

سردار شہریز خان، راولاکوٹ
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

حبیبہ اسحاق ہاشمی، واہ کینٹ
میں ڈاکٹر بن کر اپنے والدین کا سر فخر سے بلند کرنا چاہتی ہوں۔

[illegible]
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

محمد عزیر خان، ٹیکسلا
میں سیاست دان بن کر ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

میری زندگی کے مقاصد کے لیے یہ کوپن پر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام .... شہر ....

مقاصد ....

....

سنہرے لوگ

سید قاسم محمود

غلام حسین میمن

ہندوستان کے ضلع روہتک کے ایک چھوٹے سے گاؤں کھرکھودہ میں ساتویں جماعت کے ایک طالب علم سے یہ برداشت نہ ہو سکا کہ ہندو استاد تاریخ پڑھاتے ہوئے نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کرے۔ اُس نے تختی استاد کے منہ پر ماردی۔ اس پر تمام کلاس نے اُسے اس قدر مارا کہ لہولہان ہونے پر اُسے اسپتال لے جانا پڑا۔

یہ طالب علم سید گھرانے کا فرد اور کاشت کار ہاشم علی کا سب سے بڑا بیٹا قاسم علی تھا۔ والد کی خواہش تھی کہ وہ حافظِ قرآن بنے۔ ابھی اُس نے آٹھ پارے ہی حفظ کیے تھے کہ ایک روز استاد نے اس قدر مارا کہ پھر مدرسے کے بجائے والدہ نے اُسے سکول میں داخل کرادیا۔ سکول میں قاعدہ گم ہونے کی اطلاع اس لیے والدہ کو نہ دی کہ مار پڑے گی۔ اس کا حل یہ نکالا کہ اب روزانہ کا سبق ہاتھ پر لکھ لاتا اور بعد میں گھر آ کر دیوار پر لکھ لیتا۔ اس طرح ایک دن گھر کی دیواریں قاعدہ بن گئیں۔ وظیفے کے امتحان میں قاسم علی پورے پنجاب بھر میں اول آیا۔ وہ پنجاب کی تاریخ میں وظیفہ لینے والا پہلا مسلمان طالب علم تھا۔

14 اگست 1947ء کو رات بارہ بجے پاکستان کی آزادی کا اعلان ہوا۔ اس اعلان سے چند دن قبل قاسم علی کے والد دیگر گھر والوں کے ہمراہ شادی کی ایک تقریب میں شرکت کے لیے دہلی گئے تھے۔ گھر اور جانوروں کی حفاظت کے لیے قاسم علی اکیلا رہ گیا۔ والد کی آمد سے قبل ہی ہندو مسلم فسادات نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بے سروسامانی کے عالم میں وہ بھی گاؤں والوں کے ساتھ ہی چل پڑا۔ راستے میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کیا۔ تین ہزار افراد میں سے بہ مشکل تین چار افراد ہی زندہ بچ پائے۔ ان میں ایک قاسم علی بھی تھا جس نے فصلوں میں چھپ کر جان بچائی۔ پہلا پڑاؤ والٹن کیمپ لاہور میں ہوا۔ اُسے اب والدین کی تلاش تھی۔ وہ والٹن کیمپ میں مہاجروں کی خدمت میں مصروف تھا، مگر بدن پر موجود اکلوتا جوڑا پھٹ چکا تھا۔ نئے جوڑے کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ عیدالاضحی کی آمد آمد ہے۔ عید کے دن مسجد کے باہر ٹوکن دے کر جوتے سنبھالنے کا کام شروع کر دو۔ انھیں مشورہ پسند آیا۔ نمازِ عید کے بعد نمازی باہر نکلنے شروع ہوئے۔ ان میں پہلے نمازی ہاشم علی اور ان کے چھوٹے بیٹے تھے۔ قاسم علی کے لیے باپ اور بھائی کا یوں ملنا ایک ناقابلِ بیان خوشی تھی۔ پھر وہ باپ کے ساتھ چل پڑا۔ اب وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ہی تھا۔ مزدوری کرنا اُس نے جاری رکھی۔ اسی دوران ماہنامہ "عالمگیر" میں ملازمت مل گئی۔ یہاں پر نام ور ادیبوں کی صحبت سے انھیں اُردو ادب سے لگاؤ ہوا۔ ان ہی دنوں میٹرک کے امتحان کا نتیجہ آ گیا اور امتیازی نمبروں کی بنا پر پنجاب یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی۔ ادبی صلاحیتوں میں نکھار حلقہ اربابِ ذوق میں جانے سے پیدا ہوا۔ اب وہ قاسم علی سے قاسم محمود بن چکے تھے۔

12 اکتوبر 1951ء کو جمعہ کے دن وہ پنجاب کے گورنر سردار عبدالرب نشتر کے سامنے موجود تھے اور ملازمت کے اُمیدوار تھے۔ وہ مجلس دفتری زبان کے تحریری امتحان میں اول آئے تھے۔ مطلوبہ قابلیت گو کہ کم تھی، مگر تحریری امتحان میں ان کے نمبر سب سے

زیادہ تھے۔ سردار عبدالرب نشتر نوجوان قاسم محمود کو دیکھ کر متاثر ہوئے۔ ملازمت کے احکامات دیتے ہوئے سردار عبدالرب نشتر نے جو نصیحت انہیں کی، وہ اسے ساری زندگی نہیں بھولے۔ گورنر نے کہا: ”پاکستان کی تقدیر تم جیسے نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے۔ افسوس کہ اُردو ادب میں شاعری اور جذبات نگاری تو بہت ہے، مگر ٹھوس علمی مواد کی کمی ہے۔ کوئی ڈھنگ کی لغت نہیں، کوئی انسائیکلوپیڈیا نہیں۔“

کچھ وقت انہوں نے ترجمہ کرنے اور افسانے لکھنے میں گزارا۔ رسالہ لیل ونہار میں سبط حسن اور فیض احمد فیض کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ یہاں سو سالہ جنگِ آزادی نمبر مرتب کیا۔ سیارہ ڈائجسٹ اور ادبِ لطیف کی ادارت کی۔ نیشنل بک کونسل میں بھی رہے اور یہاں سے ماہنامہ ”کتاب“ کا اجراء ان کی کوششوں سے ہوا۔ سردار عبدالرب نشتر کی نصیحت مسلسل ان کو معلوماتی کام کے لیے تیار کرتی رہی۔ بالآخر قسط وار انسائیکلوپیڈیا معلومات کا اجراء کیا۔

مشہور کتابوں ”آوازِ دوست“، ”سفر نصیب“، اور ”لوحِ ایام“ کے مصنف مختار مسعود کے ساتھ مینار پاکستان کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے مینار پاکستان کے چبوترے پر 19 تاریخی تختیوں کی تدوین، کھدائی اور تنصیب کا کام سرانجام دیا۔ انہوں نے پاکستان کی سبز کتاب یعنی قائداعظم کا پیغام مرتب اور شائع کی۔

1975ء میں لاہور میں مکتبہ شاہکار قائم کیا اور اسلامی انسائیکلوپیڈیا کی تحقیق اور اشاعت کو ممکن بنایا۔ اس انسائیکلوپیڈیا نے عوام اور خواص میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ یہ ایک ادارے کے کرنے کا کام تھا جو تن تنہا سید قاسم محمود نے مکمل کیا۔

انہیں کتاب سے عشق تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کتاب گھر گھر پہنچے۔ اس کے لیے کتاب کی قیمت کا عام قاری کے لیے کم ہونا لازمی تھا۔ 1981ء میں کراچی میں مکتبہ شاہکار قائم کرتے وقت ان کا عزم یہی تھا۔ لائٹ ہاؤس کے سامنے حسن علی آفندی روڈ پر واقع اس مکتبہ سے کم قیمت کتابوں کے سفر کا آغاز ہوا۔ اب وہ دہری ذمہ داری نبھا رہے تھے۔ ایک جانب سستی کتابیں شائع کرکے گھر گھر پہنچا رہے تھے تو دوسری جانب سردار عبدالرب نشتر کے حکم کا پاس رکھتے ہوئے انسائیکلوپیڈیا کی تحقیق اور اشاعت کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے۔ انہوں نے سائنس انسائیکلوپیڈیا کی قسط وار اشاعت کا آغاز کیا اور فلکیات اور ایجادات کی قسطیں مکمل کیں۔ اس کے علاوہ انسائیکلوپیڈیا کائنات، مسلم سائنس داں اور اسلامی سائنس بھی مرتب کیے۔ عالمی طرز کے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلوپیڈیا امریکانا کی طرح انہوں نے پاکستان کی تاریخ کا احاطہ کرنے کے لیے انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا کی تحقیق میں وقت گزارا اور بالآخر اسے بھی مکمل کرکے پاکستانی عوام کو تحفہ دیا۔

انہوں نے علم القرآن کے نام سے اُردو تراجم و تفاسیر کے انتخاب پر مشتمل الگ الگ پارے شائع کیے جو دین کی ایک بڑی خدمت تھی۔ اس سے اب بھی فائدہ اٹھایا جارہا ہے اور اٹھایا جاتا رہے گا۔ ماہنامہ مطالعہ پاکستان اور پاکستان ڈائجسٹ جاری کیا۔ فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت جامعہ پاکستانیہ قائم کیا۔ ”دھوپ چھاؤں“ کے نام سے اپنی آپ بیتی بھی لکھی جو دراصل قیامِ پاکستان اور پاکستان کی تاریخ ہے۔

سید قاسم محمود نے افسانے لکھے، تراجم کیے۔ سائنس میگزین صحت، سیارہ و دیگر ڈائجسٹ کے مدیر رہے۔ علم القرآن کے نام سے ترجمہ اور تفاسیر کا انتخاب جمع کر کے شائع کرایا، اُردو زبان کو کئی انسائیکلوپیڈیاز کے تحفے دیے جو دراصل سردار عبدالرب نشتر سے کیے گئے وعدے کو نبھانا تھا۔ یہ تمام علمی کام ایک مختصر سی زندگی میں کیسے ممکن ہیں......؟ اس کا مختصر جواب یہی ہے کہ ایسے کام محنت، لگن اور جنون سے ہی کرنا ممکن ہوتے ہیں۔ وہ روزانہ 18 گھنٹے کام کرتے تھے۔ فالج کا حملہ ہونے پر دائیں ہاتھ سے کام کرنا ممکن نہ رہا تو انہوں نے بائیں ہاتھ سے کام لے کر لکھنے کا کام جاری رکھا۔

آخری دنوں میں وہ انسائیکلوپیڈیا قرآنیات پر کام کر رہے تھے اور ابھی اس کی صرف چھ قسطیں ہی شائع کر پائے تھے کہ موت کا بلاوا آ گیا۔ انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ مثبت کام ہی انسان کو کامیابی سے ہم کنار کرتا ہے۔

سید قاسم محمود 17 نومبر 1928ء کو کھرکھودہ میں پیدا ہوئے اور اپنی زندگی کی آخری سانس 31 مارچ 2010ء کو لاہور میں لی۔ انہوں نے اپنی 82 سالہ زندگی کا ہر لمحہ کتاب کی ترویج و اشاعت میں گزارا۔ ان کے طویل تحقیقی علمی کام کو دیکھ کر ایک بار مشہور شاعر رئیس امروہوی نے کہا تھا کہ ان کے قبضے میں کوئی جن ہے جو ان سے یہ کام کروا رہا ہے۔

معلوماتِ عامہ

☆ حضرت آدمؑ سری لنکا میں، حضرت نوحؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت ہارونؑ اردن میں، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ فلسطین میں، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اسرائیل میں، حضرت صالحؑ، حضرت یونسؑ لبنان میں، حضرت زکریاؑ اور یحییٰؑ شام میں، حضرت ہودؑ یمن میں، حضرت لوطؑ عراق میں، حضرت ایوبؑ اومان میں، حضرت اسماعیلؑ اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سعودی عرب میں دفن ہیں۔

(رخسانہ خان، شیدو)

☆ پانچ دریاؤں کی سرزمین پنجاب کو کہتے ہیں۔
☆ جھیلوں کی سرزمین فن لینڈ کو کہتے ہیں۔
☆ ایشیا کا کاسہ ایران کو کہتے ہیں۔
☆ سرمنڈے بھکشوؤں کا دیس جنوبی کوریا کو کہتے ہیں۔
☆ سکوت صبح کی سرزمین کوریا کو کہتے ہیں۔
☆ سفید ہاتھیوں کی سرزمین تھائی لینڈ کو کہتے ہیں۔
☆ جزیروں کا دیس انڈونیشیا کو کہتے ہیں۔
☆ بحرالکاہل کی کنجی سنگاپور کو کہتے ہیں۔
☆ زمرد کا جزیرہ آئرلینڈ کو کہتے ہیں۔
☆ سیاہ فام لوگوں کی سرزمین سوڈان کو کہتے ہیں۔
☆ آزاد لوگوں کی سرزمین تھائی لینڈ کو کہتے ہیں۔
☆ صحرا کا چمن ایتھوپیا کو کہتے ہیں۔
☆ بحرہند کا موتی سری لنکا کو کہتے ہیں۔
☆ یورپ کا گھر ہالینڈ کو کہتے ہیں۔
☆ اقوام کی سرزمین بھارت کو کہتے ہیں۔
☆ ماہرین آثار قدیمہ کی جنت کولون (جرمنی) کو کہتے ہیں۔
☆ لعل پاکستان کراچی کو کہتے ہیں۔
☆ مشرق کی دلہن غزنی (افغانستان) کو کہا جاتا تھا۔

(فرحان اشرف، بہاول نگر)

☆ وہیل مچھلی ہمیشہ ایک آنکھ کھول کر سوتی ہے۔
☆ دُنیا کی سب سے بڑی سونے کی کان جنوبی افریقہ میں ہے۔
☆ دُنیا کی سب سے خوب صورت اور بڑی تتلی نیوگنی میں پائی جاتی ہے جس کی لمبائی دس انچ ہے۔
☆ دُنیا میں پھلوں میں سب سے زیادہ کیلا اور سبزیوں میں آلو پیدا ہوتا ہے۔
☆ دُنیا کا سب سے چھوٹا بچہ 1992ء میں انگلینڈ میں پیدا ہوا۔ پیدائش کے وقت اُس بچے کی لمبائی صرف چھ انچ تھی۔
☆ بابائے سائنس ارسطو کو کہا جاتا ہے۔
☆ ابھرتے سورج کی سرزمین جاپان کو کہا جاتا ہے۔
☆ سنہری ریشے کی سرزمین بنگلہ دیش کو کہتے ہیں۔
☆ زمین کی جنت وادی کشمیر کو کہا جاتا ہے۔
☆ شاہ بلوط کو درختوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔
☆ بیلجیئم میں ننگے پاؤں چلنا جرم ہے۔
☆ پیاز کاٹتے وقت چیونگم چبانے سے آنکھوں میں آنسو نہیں آتے۔

(سرمد شمریز، راولا کوٹ)

☆ سب سے زیادہ ناریل انڈونیشیا میں اُگتے ہیں۔
☆ دُنیا کا سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن امریکہ میں ہے۔
☆ پاکستان کا سب سے قدیم شہر ملتان ہے۔

(عائشہ ملک، میاں والی)

☆ ایرانی فاتح نادر شاہ ایک چرواہے کا بیٹا تھا۔
☆ روس کا صدر اسٹالن موچی کا بیٹا تھا۔
☆ مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر غریب گڈریے کا بیٹا تھا۔
☆ یونان کا مشہور فلسفی سقراط ایک معمار کا بیٹا تھا۔
☆ مشہور سائنس دان نیوٹن کسان کا بیٹا تھا۔
☆ امریکی صدر آئزن ہاور ایک اخبار فروش کا بیٹا تھا۔
☆ معروف باکسر محمد علی ایک پینٹر کا بیٹا تھا۔

(محمد جعفر، گوجرانوالہ)

یہ ہیں ہمارے اقبال

رانا محمد شاہد

ہماری قومی زندگی میں جن اہم ترین شخصیات نے بھٹکی ہوئی قوم کو اندھیروں سے نکال کر منزل مقصود کی روشنی عطا کی، علامہ محمد اقبال اُن میں سے ایک ہیں۔ شاعر مشرق کا شمار عظیم مسلم رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ دو قومی نظریے کی بنیاد پر علیحدہ مملکت کا تصور پیش کرنے کی وجہ سے آپ کو ''مصور پاکستان'' کہا جاتا ہے۔

علامہ محمد اقبال کے والد کا نام شیخ نور محمد اور والدہ کا نام بے جی تھا۔ والد سلائی کڑھائی کی ایک چھوٹی سی دُکان کرتے تھے جب کہ والدہ ایک نیک اور پاک باز خاتون تھیں۔ گھر میں بچوں کو قرآن مجید پڑھانا ان کا معمول تھا۔ نیکی اور پرہیز گاری کی یہ صفت علامہ اقبال میں بچپن ہی سے موجود تھی جو کہ والدین کی تربیت کا نتیجہ تھی۔

علامہ اقبال کی پیدائش سے چند دن پہلے آپ کے والد نے ایک خواب دیکھا۔ خواب بہت عجیب و غریب تھا۔ ایک عقاب کی طرح کا خوب صورت و رنگین پرندہ سطح زمین سے تھوڑی بلندی پر فضا میں اڑ رہا ہے۔ لوگ بڑے شوق سے دیکھ رہے ہیں اور پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اتنے میں وہ خوب صورت پرندہ اڑتے ہوئے ایک دم ان کی (شیخ نور محمد کی) گود میں آ بیٹھا۔ اس خواب کے متعلق آپ کے والد اکثر کہا کرتے کہ ایک خوش رنگ اور اُونچی اڑان والے پرندے کی شکل میں اللہ نے پہلے ہی مجھے اقبال جیسے لائق فرزند کی بشارت دے دی تھی۔

اقبال نے ابتدائی تعلیم سید میر حسن کے مدرسے سے حاصل کی۔ قرآن مجید کے ساتھ ساتھ انہوں نے عربی اور فارسی میں بھی تعلیم حاصل کی۔ سید میر حسن کو بچے کی ذہانت ولیاقت کا اندازہ ہوا تو جلد ہی اُن کے مشورے سے اقبال کو سیالکوٹ کے سکاچ مشن سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ سید میر حسن خود ایک نہایت مہربان اور شفیق استاد تھے۔

اقبال بچپن ہی سے ذہین اور دُوسرے بچوں سے زیادہ سمجھ دار تھے۔ ایک روز اقبال سکول میں دیر سے پہنچے تو استاد نے وجہ پوچھی، اقبال نے بے ساختہ جواب دیا۔ ''استاد محترم اقبال دیر ہی سے آتا ہے۔'' اقبال کا مطلب ہے خوش بختی، بلند مقام۔ گویا یہ جواب دیتے ہوئے اقبال کا اشارہ اس طرف تھا کہ بلند مقام و مرتبہ فوراً حاصل نہیں ہوتا بلکہ سخت محنت اور جدوجہد ہی یہ مقام دلاتی ہے۔ اسی طرح ایک اور واقعہ سے اقبال کی ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بھی آپ کے بچپن کا ہی واقعہ ہے۔

علامہ اقبال کے استاد سید میر حسن کو سب شاگرد شاہ صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ ایک دفعہ شاہ صاحب کسی کام سے گھر سے نکلے۔ ایک صحت مند بچہ جس کا نام احسان تھا، ان کے پاس تھا۔ انہوں نے اقبال سے کہا۔ ''اقبال! اسے گود میں اٹھا لو۔'' اقبال نے اسے اٹھا لیا۔ شاہ صاحب چلتے چلتے ذرا آگے نکل گئے۔ انہیں اندازہ تھا کہ اقبال بھی بچے کو گود میں اٹھائے ان کے پیچھے پیچھے آ رہا ہو گا۔ جب انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اقبال وہاں نہ تھے۔

وہ واپس مڑے تو دیکھا کہ اقبال ایک دکان کے سامنے کھڑے ہیں، پاس ہی دکان کے تختے پر احسان بیٹھا ہے۔ شاہ صاحب نے اقبال کو مخاطب کیا۔ ''اقبال! کیا اس بچے کو اٹھانا بہت مشکل تھا؟'' اقبال کے منہ سے فوراً نکل گیا۔

''آپ کا احسان بہت بھاری ہے۔''

علامہ اقبال کو پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر پڑھتے رہتے۔ یہی وجہ تھی کہ پانچویں کے امتحان میں اپنی محنت سے وظیفہ حاصل کیا۔ پھر مڈل کے امتحان میں بھی وظیفہ ملا۔ آپ نے میٹرک کا امتحان سکاچ مشن کالج (موجودہ مرے کالج) سے پاس کیا۔ 1897ء میں بی اے کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ وظیفے کے ساتھ دو طلائی تمغے بھی ملے۔ پھر لاہور آ گئے اور یہاں گورنمنٹ کالج سے ایم اے (فلسفہ) میں داخلہ لیا۔ یہاں آ کر خوب محنت کی اور ایم اے فلسفہ میں یونیورسٹی بھر میں اول پوزیشن کے ساتھ گولڈ میڈل حاصل کیا۔

علامہ اقبال گورنمنٹ کالج کے ہاسٹل میں رہتے تھے۔ چھٹیوں میں جب واپس سیالکوٹ اپنے والدین کے پاس جاتے تو والدین اور بہن بھائی خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ خاص طور پر آپ کی والدہ کی خوشی دیدنی ہوتی۔ ''میرا بالی آ گیا..... میرا بالی آ گیا'' کہتے ہوئے اپنے لاڈلے اقبال کو گلے لگا لیتیں۔ وہ پیار سے اقبال کو ''بالی'' کہا کرتی تھیں۔

علامہ اقبال کو اپنے استاد خاص طور پر مولوی میر حسن سے بہت محبت تھی۔ اپنے استاد سے محبت کا حق تو انہوں نے اس وقت ادا کیا جب انگریز سرکار نے آپ کو سر کا خطاب دینا چاہا۔ علامہ اقبال کے علم و ادب کی شہرت ہندوستان سے یورپ تک پہنچ چکی تھی۔ اقبال کے انگریز استاد نکلسن نے ان کی کتاب ''اسرارِ خودی'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ یوں اقبال کی علمی و ادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے انگریز حکومت نے انہیں ''سر'' کا خطاب دینا چاہا۔ پنجاب کے انگریز گورنر نے جب آپ سے کہا کہ حکومتِ برطانیہ آپ کو ''سر'' کے خطاب سے نوازنا چاہتی ہے تو علامہ اقبال نے گورنر سے کہا۔

''جب تک میرے استاد مولوی میر حسن کی علمی خدمات کا اعتراف نہیں کیا جاتا، میں کسی خطاب کو قبول نہیں کر سکتا۔''

گورنر نے پوچھا: ''کیا مولوی میر حسن نے کوئی کتاب بھی لکھی ہے؟''

اقبال نے فوراً جواب دیا۔ ''میں ان کی زندہ کتاب ہوں۔''

انگریز گورنر اقبال کا جواب سن کر حیران رہ گیا۔ یوں اقبال کی بات مان لی گئی اور علامہ اقبال کو سر کا خطاب دیتے وقت ان کے استاد مولوی میر حسن کو شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔

علامہ اقبال کا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں گزرتا۔ انہیں لکھنے پڑھنے سے اتنی فرصت نہیں ملتی تھی کہ وہ گھر کے دیگر معاملات کی طرف دھیان دیتے۔ وہ زیادہ تر کرسی پر بیٹھے یا پلنگ پر لیٹے کتابیں پڑھنے میں مصروف رہتے۔ کمرے میں چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں ہوتی تھیں چونکہ ان کا زیادہ وقت کتابوں کے ساتھ گزرتا تھا اس لیے لوگ ان کے پاس کم ہی جاتے تھے۔ آپ کی پڑھنے کی رفتار بہت تیز تھی۔ آپ ایک سے دو گھنٹے میں کتاب ختم کر لیتے تھے۔ عمر کے آخری حصے میں آپ کا زیادہ وقت قرآن مجید کے مطالعے میں گزرتا۔ ایک دفعہ آپ نے کہا۔

''میں نے جو کچھ بھی حاصل کیا، قرآن پاک سے ہی حاصل کیا۔''

علامہ اقبال کا یہ معمول تھا کہ وہ رات کو جلدی سو جاتے اور صبح تین بجے کے قریب اٹھ جاتے۔ نماز کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتے اور پھر مطالعہ میں مصروف ہو جاتے۔ قرآن پاک کی صداقت و حقیقت ہی ان کی زندگی اور شاعری کا حاصل تھی۔ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے ہندوستان سے روانہ ہونے لگے تو دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر آپ کے استقبال کے لیے تین ہزار سے زائد لوگ جمع تھے۔ جیسے ہی گاڑی رکی اور آپ ڈبے سے باہر آئے تو ہجوم نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور آپ پر پھولوں کی بارش کر دی۔ آپ نے ہزاروں افراد کے اس مجمعے سے جو آپ کو انگلستان کے لیے روانہ کرنے آیا تھا مختصر خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

''میرے ساتھ نہ تو کوئی پرائیویٹ سیکرٹری ہے اور نہ سیاسی لٹریچر کا پلندہ..... جس پر میں اپنے دلائل کی بنیاد رکھ سکوں۔ میرے ساتھ صرف حق و صداقت کی جامع کتاب ''قرآن مجید'' ہے۔ جس کی روشنی میں مسلمانوں کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا۔''

علامہ اقبال کے مزاج میں ظرافت کا عنصر بھی موجود تھا۔ اکثر

مزاح ہی مزاح میں انتہائی گہری بات کر جاتے تھے۔ ایک دفعہ چند ماڈرن قسم کے لڑکوں نے علامہ اقبال سے ملاقات کی۔ ان لڑکوں کے بال لڑکیوں کی طرح تھے۔ کانوں میں ٹاپس اور بالیاں تھیں یعنی ان کی شکل وصورت مضحکہ خیز تھی۔ ان لڑکوں نے علامہ سے ملاقات کے دوران پوچھا کہ آپ لڑکیوں کو پردے میں بٹھانے کے حق میں کیوں ہیں؟ علامہ نے ان کی طرف شرارت بھری مسکراہٹ سے دیکھا اور کہا۔

"آپ لڑکیوں کی بات کرتے ہیں، میں تو آپ جیسوں کو بھی پردے میں بٹھانے کی فکر کر رہا ہوں۔"

علامہ اقبال کا اپنے گھریلو ملازموں کے ساتھ رویہ نہایت مشفقانہ تھا۔ انہوں نے کسی ملازم کو نہ کبھی ڈانٹا اور نہ بُرا بھلا کہا۔ بلکہ ان کی غلطیوں پر ہمیشہ مسکرا دیا کرتے تھے۔ علامہ اقبال کا اپنے ملازم علی بخش سے کالج کے زمانے سے تعلق تھا۔ علی بخش ہوسٹل میں ملازم تھا اور آپ کے لیے کھانا وغیرہ تیار کرتا تھا۔ اقبال تعلیم سے فراغت کے بعد اسے اپنے ساتھ لے آئے اور جب انگلستان جانے لگے تو اسے اپنے گھر سیالکوٹ بھجوا دیا۔ علامہ اقبال اسے باقاعدہ تنخواہ دیتے اور وہ بھی تمام عمر علامہ کی خدمت کرتا رہا۔ یہ علامہ اقبال کی اپنے ملازموں کے ساتھ محبت تھی کہ جو بھی آپ کے پاس آجاتا پھر وہ کہیں نہیں جاتا تھا۔

علامہ اقبال نہایت سادہ مزاج تھے۔ ان کا لباس سادہ اور کم قیمت ہوتا۔ انگریزی لباس پسند نہ کرتے تھے، گھر کے اندر عموماً تہ بند اور بنیان ہی پہنتے۔ انگلستان سے واپسی پر صرف عدالت جانے کے لیے انگریزی سوٹ پہنتے، پھر گھر آتے ہی اپنے خاص ملازم کو آواز دیتے۔ "علی بخش! انسانوں والے کپڑے لے کر آؤ۔" ان کپڑوں سے نجات حاصل کر کے سکون محسوس کرتے۔ شلوار قمیص آپ کا پسندیدہ لباس تھا۔ لباس چاہے کتنا ہی سادہ کیوں نہ ہو، ان کے جسم پر بہت بھلا لگتا۔ آپ امانت و صداقت کا نمونہ تھے۔ قناعت و بے نیازی آپ کے خاص اوصاف تھے۔ قرآن کریم اور اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو باہمی اخوت و محبت میں ڈھالنا ہی اقبال کا حقیقی پیغام تھا۔

علامہ اقبال اپنی قوم کے بچوں کو شاہین جیسی خصوصیات کا حامل دیکھنا چاہتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں بار بار شاہین کا ذکر ملتا ہے۔ آپ نے ایک شاہین کی خصوصیات کو کچھ یوں بیان کیا ہے۔

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
پرندوں کی دُنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

دانائی

اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ کو علم وفراست سے نوازا تھا۔ عدل وانصاف کے معاملے میں آپ کا ہر فیصلہ شریعت کے تمام تقاضے پورے کرتا تھا۔ آپؓ نے اپنی حکمت ودانائی سے ایسے فیصلے فرمائے جو رہتی دُنیا تک بنی نوع انسانوں کے لیے ہدایت کا پیغام ہیں۔ ایسا ہی ایک مقدمہ حضرت علیؓ کی خدمت میں پیش ہوا کہ ایک شخص اپنے غلام کے ساتھ سفر پر روانہ ہوا۔ راستے میں آقا اور غلام کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ چونکہ آقا بہت سخت طبیعت کا مالک تھا، وہ ہمیشہ اپنے غلام کو پریشان کرتا تھا جس کی وجہ سے تنگی اس قدر بڑھی کہ اس کے غلام نے نہ صرف غلامی سے انکار کیا بلکہ اپنے آقا کو کہا میں تیرا غلام نہیں بلکہ تو میرا غلام ہے۔ دونوں جھگڑتے ہوئے واپس کوفہ پہنچے ہر ایک کا یہی دعویٰ تھا کہ تو میرا غلام ہے۔ آخر یہ معاملہ حضرت علیؓ کی خدمت میں پیش ہوا۔ دونوں نے اپنے آقا ہونے کا دعویٰ کیا۔ آپؓ نے معاملہ سننے کے بعد فرمایا: "اچھا اب تم دونوں گھر جاؤ کل پھر آنا میں تمہارا فیصلہ کر دوں گا۔" یہ دونوں اپنے گھر روانہ ہوئے۔ آپؓ نے اپنے غلام قنبر سے فرمایا: "دیوار میں دو سوراخ کرو جس میں آسانی کے ساتھ سر جا سکے اور جب یہ دونوں اپنا سر اس سوراخ سے پار کر لیں تو میں تمہیں حکم دوں گا کہ غلام کا سر قلم کر دو تو فوراً تلوار نکال لینا مگر سر قلم نہ کرنا۔" دوسرے دن یہ دونوں آپؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؓ نے انہیں حکم دیا کہ دونوں اپنی گردنیں اس سوراخ میں ڈال دیں۔ جب انہوں نے ایسا کیا تو آپؓ نے قنبر کو حکم دیا فوراً غلام کا سر قلم کر دو۔ ابھی قنبر نے تلوار نکالی ہی تھی کہ جو غلام تھا اس نے فوراً اپنا سر سوراخ سے باہر نکال لیا۔ اس فطری عمل نے یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ واقعی غلام ہے۔ جو آقا بنا ہوا تھا اس نے اپنا سر سوراخ سے باہر نہ نکالا۔

(مرسلہ: [illegible])

کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

کامران گھر میں داخل ہوا تو اُس کے ہاتھ میں ایک کپ تھا۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ کامران کے سکول میں سالانہ کھیلوں کا دن تھا۔ اُس نے امی جان کو بتایا کہ وہ ایک کھیل میں اوّل آیا ہے اور یہ کپ اسی وجہ سے اُسے ملا ہے۔ اُس نے یہ بتایا کہ اُس نے ایک ایسے کھیل میں حصہ لیا تھا جس میں سب سے پیچھے رہنے کے باعث اُسے اوّل انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ امی جان یہ سن کر حیران رہ گئیں۔ کامران نے جب اس کھیل کا نام بتایا تو امی جان نے آگے بڑھ کر اُسے شاباش دی۔ آپ نے کھوج لگانا ہے کہ کامران نے کس کھیل میں حصہ لیا تھا۔

مارچ 2012ء میں شائع ہونے والے "کھوج لگائیے" کا صحیح حل: موتیوں کی کُل تعداد 301 تھی اور ہر بھائی کے حصے میں 43 موتی آئے تھے۔ ہمیں جو درست جوابات موصول ہوئے ان میں سے 5 بچے بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار قرار پائے۔ ان بچوں کو 500 روپے کی کتب بطور انعام دی جا رہی ہیں۔

1۔ امجد جاوید، راول پنڈی
2۔ عائشہ رزاق، وزیر آباد
3۔ فاخرہ ساجد، کراچی
4۔ فہد انور، لاہور
5۔ محمد جواد حسن، پشاور

ہر حل کے ساتھ کوپن بھیجنا ضروری ہے۔ جواب بھیجنے کی آخری تاریخ 10 اپریل 2012ء ہے۔

کھوج لگائیے!

نام: ____________________

پتا: ____________________

____

مختصر مختصر

چھ حق

حضرت علیؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حق ہیں۔

1۔ جب ملاقات ہو تو اس کو سلام کرے۔
2۔ جب دعوت دے تو اس کی دعوت قبول کرے۔
3۔ جب اُسے چھینک آئے (اور وہ الحمد للہ کہے) تو اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہے۔
4۔ جب بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے۔
5۔ جب انتقال کر جائے تو اُس کے جنازے کے ساتھ جائے۔
6۔ اس کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

(سیماب آصف، ساہی وال)

اجر

حضرت امیر معاویہؓ تہجد کے پابند تھے۔ ایک روز وہ اپنے گھر میں سو رہے تھے کہ کسی نے آ کر جگا دیا۔ حضرت امیر معاویہؓ نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ انہیں جواب ملا کہ میں ابلیس ہوں اور آپؓ کو اس لیے جگایا ہے کہ نماز پڑھیں۔ آپؓ نے فرمایا کہ تُو اور نماز! تیرا نماز سے کیا تعلق ہے؟ اس نے کہا: ''بات یہ ہے کہ کل آپؓ کی (تہجد کی) نماز قضا ہو گئی تھی جس پر آپؓ نے اللہ تعالیٰ کے آگے گریہ وزاری کی جس پر اللہ تعالیٰ نے آپؓ کو دُہرا اجر دیا تھا۔ مجھ پر یہ بات گراں گزرا اور میں نے سوچا کہ آپؓ کو ایک ہی اجر ملے اس لیے میں نے آپؓ کو اٹھا دیا۔'' (عبداللہ مہک، شبقدر)

بہترین اور بدترین

حکیم لقمان جس آدمی کے پاس بکریاں چرایا کرتے تھے اُس نے دیکھ لیا کہ لقمان میں بڑی ذہانت ہے۔ ایک مرتبہ مالک نے کہا کہ لقمان اس ریوڑ سے ایک بکری ذبح کرو اور اس کے جسم کا سب سے اچھا حصہ لے آؤ۔ لقمان نے بکری ذبح کی اور زبان لا کر مالک کے سامنے رکھ دی۔ دو تین دن بعد پھر مالک نے لقمان سے کہا کہ بکری لے جاؤ اور اس کے جسم کا سب سے بُرا حصہ لے آؤ۔ لقمان نے بکری ذبح کی اور پھر زبان نکال کر مالک کے سامنے رکھ دی۔

مالک نے کہا: ''جب میں نے تمہیں سب سے اچھا حصہ لانے کو کہا تو تم نے زبان لا کر رکھ دی اور جب بُرا حصہ لانے کو کہا تو تم پھر بھی زبان ہی لے آئے۔''

لقمان نے کہا: ''اگر زبان بُری اور بداخلاق ہو تو یہ دُنیا کی بدترین چیز ہے اور اگر زبان اچھی اور خوش بیان ہو تو دُنیا کی سب سے اچھی چیز ہے۔'' (زریاب احمد چوہان، منڈی بہاؤالدین)

ڈر

دو دوست ایک شہر میں رہتے تھے۔ ان میں سے ایک سوداگر اور دُوسرا سمندری جہاز کا ملاح تھا۔ ایک دن سوداگر نے ملاح سے پوچھا: ''تمہارے والد صاحب نے کہاں وفات پائی تھی۔''

ملاح نے کہا: ''تم میرے والد ہی کا کیا پوچھتے ہو ہمارا پشت در پشت پیشہ جہاز رانی ہے۔ میرے والد، دادا، پردادا سب ڈوب کر مرے ہیں۔''

اس پر سوداگر بولا: ''پھر تم یہ پیشہ چھوڑ کیوں نہیں دیتے، کیا تمہیں خوف نہیں آتا کہ تم بھی ڈوب کر مرو گے۔''

ملاح نے پوچھا: ''تم اپنی بتاؤ، تمہارے باپ دادا نے کہاں وفات پائی تھی؟''

سوداگر نے کہا: ''انہوں نے گھر میں وفات پائی تھی۔''

''تو پھر تم اس گھر کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے، کیا تمہیں ڈر نہیں کہ ایک دن تم بھی اس گھر میں اپنے باپ دادا کی طرح مر جاؤ گے۔'' (محمد جعفر صادق، وہاڑی)

☆......☆......☆

شکیلہ چوہدری

نانی اماں

کردار

دانیال	....	عمر 12 سال
شمائلہ	....	عمر 10 سال
امی (روبینہ)	....	ادھیڑ عمر
ابو (قمر)	....	ادھیڑ عمر
رضیہ	....	عمر 30 سال
نانی اماں	....	عمر 65 سال کے قریب

(پہلا منظر)

(ایک کمرے کا منظر، کمرے میں ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی ہے۔ بائیں طرف دروازہ ہے جب کہ دائیں طرف کھڑکی ہے۔ ایک بیڈ کھڑکی کے ساتھ بچھا ہے۔ کھڑکی کے بائیں طرف ایک میز کرسی دھری ہے۔ میز پر کمپیوٹر رکھا ہوا ہے۔ یہ کمرہ بارہ سال دانیال کا ہے۔ رات کے دس بجے ہیں۔ دانیال کمپیوٹر پر ایک گیم کھیل رہا ہے۔ دانیال کی دس سالہ بہن شمائلہ کمرے میں آتے ہی بولتی ہے۔)

شمائلہ: (کمرے میں آتے ہی) دانیال تم نے کچھ سنا ہے۔

دانیال: میں نے وہی سنا ہے جو تم نے کہا ہے۔

شمائلہ: میرا مطلب یہ نہیں ہے۔

دانیال: (مسلسل کمپیوٹر پر گیم کھیلنے میں مصروف ہے) تو پھر تمہارا کیا مطلب ہے؟

شمائلہ: اس کا مطلب ہے تمہیں کچھ پتا نہیں۔

دانیال: تم کچھ بتاؤ گی تو مجھے کچھ پتا چلے گا۔

شمائلہ: بھیا! بے خبری کی بھی انتہا ہوتی ہے۔

دانیال: اچھا تو بے خبری کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ ایسی کون سی اہم خبر ہے جو مجھے معلوم نہیں۔

شمائلہ: بہت اہم خبر ہے۔

دانیال: اچھا تو بریکنگ نیوز ہے۔

شمائلہ: جی بالکل بریکنگ نیوز ہے۔

دانیال: (زچ ہو کر) اچھا اب وہ بریکنگ نیوز سنا بھی دو، اتنا سسپنس بھی اچھا نہیں ہوتا۔

شمائلہ: (دانیال کو تنگ کرنے کے انداز میں کہتی ہے) تو بھیا واقعی آپ کو کچھ نہیں پتا۔

دانیال: ہاں...... ہاں...... واقعی مجھے کچھ نہیں پتا، بتاؤ ورنہ یہاں سے جاؤ۔

شمائلہ: اچھا...... اچھا بابا بتاتی ہوں، بتاتی ہوں۔

دانیال: (اپنی جگہ سے اٹھ کر شمائلہ کو مارنے لگتا ہے تو وہ بیڈ کے بائیں طرف چلی جاتی ہے) شمائلہ کی بچی، بتاؤ کیا بتانے آئی تھی؟ ورنہ ایک ہاتھ دوں گا۔

شمائلہ: وہ بریکنگ نیوز یہ ہے کہ نانی اماں کراچی سے کل

ہمارے گھر آ رہی ہیں۔

دانیال: (نانی اماں کا سن کر دانیال دھڑام سے بیڈ پر گر جاتا ہے۔) لو پھر ہمارے بُرے دن شروع ہونے والے ہیں، ہر وقت گھر میں یہ آواز گونجے گی، دانیال ادھر آؤ، شمائلہ میری بات سنو، یہ کرو، وہ نہ کرو، ادھر جاؤ ادھر نہ جاؤ وغیرہ وغیرہ۔

شمائلہ: (لہجے میں اداسی ہے) ہاں اب ایسا ہی ہو گا۔ پچھلی مرتبہ بھی تو ایسا ہی ہوا تھا۔

دانیال: (کچھ سوچ کر) ہمیں کچھ ایسا کرنا چاہیے جس سے نانی اماں ہمارے ہاں زیادہ دن نہ ٹھہریں۔

شمائلہ: ایسا کس طرح ہو سکتا ہے؟

دانیال: ایسا ہو سکتا ہے۔

شمائلہ: وہ کس طرح؟

دانیال: کان ادھر لاؤ۔

(شمائلہ اپنا کان دانیال کے منہ کے آگے کرتی ہے تو وہ اس کے کان میں کھسر پھسر کرتا ہے۔)

شمائلہ: (فوراً بولتی ہے) یہ تو بہت مشکل کام ہے۔

دانیال: ہمیں یہ مشکل کام کرنا ہو گا ورنہ نانی اماں کا قیام ہمارے ہاں طویل بھی ہو سکتا ہے۔

شمائلہ: کوئی اور راستہ نہیں۔

دانیال: نہیں، ہمیں اسی راستے پر چلنا ہو گا۔

شمائلہ: تو پھر ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ ہوں۔

دانیال: ہم اپنی ترکیب پر عمل چند دنوں بعد کریں گے۔

شمائلہ: ٹھیک ہے۔

(دُوسرا منظر)

(ڈرائنگ روم کا منظر۔ ڈرائنگ روم خاصا بڑا ہے۔ عمدہ صوفے دھرے ہیں اور نفیس پردے کھڑکیوں اور دروازوں پر دکھائی دے رہے ہیں، فرش پر ایک نہایت قیمتی قالین بچھا ہے۔ ڈرائنگ روم میں دانیال، شمائلہ، امی، ابو اور نانی اماں موجود ہیں۔ ابو جان نانی اماں کو ایئر پورٹ سے لے کر آئے ہیں)

روبینہ: (اپنی امی کے گلے لگتے ہوئے) امی جان! اتنے دنوں بعد کیوں آئی ہیں؟

نانی اماں: بیٹیوں کے گھر زیادہ نہیں آیا کرتے۔

قمر: یہ تو آپ کے بیٹے کا گھر ہے۔

نانی اماں: (قمر کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے) جیتے رہو، خوش رہو، واقعی یہ میرے بیٹے کا گھر ہے۔

(دانیال اور شمائلہ ابھی تک خاموش ہیں۔ نانی اماں یہ بات محسوس کر لیتی ہیں)

نانی اماں: (دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے) تم دونوں خاموش کیوں ہو، کیا میرا آنا تمہیں اچھا نہیں لگا؟

دانیال، شمائلہ: (یک زبان ہو کر) نہیں نانی اماں، آپ کے آنے سے ہمیں بہت خوشی ہوئی ہے۔

نانی اماں: (دونوں کو گھورتے ہوئے) تمہارے چہروں سے تو ایسا نہیں لگ رہا۔

(اسی اثناء میں گھریلو ملازمہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی ہے۔ اس نے اچھے کپڑے پہن رکھے ہیں)

رضیہ: (ماتھے پر ہاتھ رکھ کر) السلام علیکم ماں جی!

نانی اماں: (خوش دلی کے ساتھ) وعلیکم السلام

رضیہ: (روبینہ کو مخاطب کر کے) بیگم صاحبہ کھانا تیار ہو گیا ہے۔

روبینہ: تو پھر کھانا لگا دو۔

رضیہ: اچھا بیگم صاحبہ!

(رضیہ وہاں سے چلی جاتی ہے)

روبینہ: امی جان آپ فریش ہو جائیں اتنی دیر میں رضیہ کھانا لگا دیتی ہے۔

نانی اماں: ٹھیک ہے (ذرا ٹھہر کر) تو بچو! کھانے کے بعد تمہارے ساتھ باتیں کروں گی۔

(تیسرا منظر)

(کھانے کا کمرہ۔ میز پر رضیہ نے کھانا چن دیا ہے۔ نانی اماں

سامنے والی کرسی پر بیٹھی ہیں۔ نانی اماں نے مٹن قورمہ پلیٹ میں ڈالا اور روٹی کا پہلا لقمہ ہی کھایا تھا کہ بے اختیار بولیں)

نانی اماں: (تعریف کرتے ہوئے) واہ رضیہ واہ...... مٹن قورمہ تم سے اچھا کوئی نہیں بنا سکتا۔

رضیہ: (مسکراتے ہوئے) شکریہ بیگم صاحبہ۔

نانی اماں: پچھلی مرتبہ تمہیں کتنا انعام ملا تھا؟

رضیہ: (کچھ یاد کرتے ہوئے) آپ نے سو روپے عنایت کیے تھے، ویسے آپ کا تعریف کر دینا ہی میرے لیے کافی ہے۔

(دانیال اور شمائلہ توجہ سے یہ گفتگو سن رہے تھے)

روبینہ: رضیہ! تمہارے مٹن قورمہ کی شہرت تو کراچی تک جا پہنچی ہے۔

نانی اماں: جو چیز اچھی ہو اس کی تعریف ضرور کرنی چاہیے۔

(رضیہ کے چہرے پر مسکراہٹ ہے)

(چوتھا منظر)

(پہلے منظر والا دانیال کا کمرہ۔ نانی اماں کے ساتھ دانیال اور شمائلہ وہاں موجود ہیں۔ نانی اماں ان کی ہوم ورک کاپیاں دیکھ رہی ہیں۔ دونوں کے چہروں پر اُداسی ہے)

نانی اماں: (دانیال کو گھورتے ہوئے) بہت بری بات، سائنس میں اتنے کم نمبر لیے ہیں، لگتا ہے تم توجہ سے پڑھ نہیں رہے۔

دانیال: میں توجہ سے پڑھ تو رہا ہوں۔

نانی اماں: تم ایسا کرتے تو تمہارے سائنس میں اتنے کم نمبر نہ آتے۔

(نانی اماں ایک ایک کر کے دونوں کی سب کاپیاں دیکھتی ہیں)

نانی اماں: (بلند آواز سے) رضیہ...... رضیہ

(تھوڑی دیر بعد رضیہ آتی ہے)

رضیہ: جی بیگم صاحبہ۔

نانی اماں: روبینہ کیا کر رہی ہے؟

رضیہ: وہ اپنے کمرے میں ہیں۔

نانی اماں: اُسے بلا لاؤ۔

رضیہ: جی بیگم صاحبہ۔

(دونوں خاموش بیٹھے ہیں۔ دانیال بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ نانی اماں اُسے ایسا کرتے دیکھ کر پوچھتی ہیں)

نانی اماں: بار بار گھڑی کیوں دیکھ رہے ہو؟

دانیال: وہ نانی اماں کارٹون نیٹ ورک پر میرے پسندیدہ کارٹون لگنے کا وقت ہو گیا ہے۔

نانی اماں: ان کارٹونوں نے بچوں کا بیڑہ غرق کر دیا ہے، ہر وقت ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھے کارٹون دیکھتے رہتے ہیں۔

(روبینہ کمرے میں داخل ہوتی ہے)

روبینہ: جی امی جان۔

نانی اماں: تم بچوں کی پڑھائی سے بالکل غافل ہو۔

روبینہ: امی جان کیا کروں گھر کے کاموں سے فرصت ملے تو ان کی پڑھائی پر توجہ دوں، ویسے ایک اچھا ٹیوٹر انہیں پڑھانے کے لیے آتو رہا ہے۔

نانی اماں: (فوراً بولتی ہیں) ٹیوٹر کیا خاک پڑھا رہا ہے۔ دونوں کے ہر مضمون میں نمبر بہت کم ہیں۔ میں اب جتنے دن یہاں ہوں میں خود بچوں کو پڑھاؤں گی۔

(یہ سن کر دانیال اور شمائلہ کے چہرے مزید اُداس ہو گئے)

(پانچواں منظر)

(دانیال کا کمرہ۔ دانیال اور شمائلہ منہ لٹکائے بیٹھے ہیں۔)

دانیال: (پاؤں زمین پر مارتے ہوئے) میں تو تنگ آ گیا ہوں۔ اتنے بجے سو جاؤ، اتنے بجے اٹھ جاؤ، یہ کرو وہ نہ کرو، نانی اماں کے آنے سے تو ہم مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ لگتا ہے ہمیں ترکیب نمبر دس استعمال کرنا ہی پڑے گا۔

شمائلہ: اب اس ترکیب کو استعمال کیے بغیر گزارا نہیں۔

دانیال: کیبل کے بغیر بھی کوئی زندگی ہے۔

شمائلہ: ہاں کیبل دیکھنے میں مزا آتا تھا، نانی اماں نے وہ بھی بند کروا دی۔

دانیال: (لہجے میں سختی اور غصہ ہے) ابا جان سے کہہ کر میرا موبائل فون بھی واپس لے لیا۔ موبائل فون کے ذریعے دوستوں سے خوب گپ شپ ہوتی تھی۔ خوب مزے مزے کے ایس ایم ایس کرتے تھے، آہ میرا موبائل فون۔

شمائلہ: اس سے پہلے کہ ہم پر مزید سختی ہو ہمیں اپنی ترکیب پر عمل کرنا چاہیے۔

دانیال: ہم آج شام ہی اپنی ترکیب پر عمل کرتے ہیں۔

(چھٹا منظر)

(باورچی خانے کا منظر، رضیہ وہاں برتن دھونے میں مصروف تھی۔ دانیال اور شمائلہ کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ برتن دھونے بند کر دیتی ہے)

رضیہ: کیا کسی چیز کی ضرورت ہے؟

دانیال: نہیں، ہم تو ایک بہت اہم کام کے سلسلے میں آئے ہیں۔

رضیہ: بتاؤ کیا کام ہے؟

دانیال: کل نانی اماں، ماما سے کہہ رہی تھیں کہ مجھے شک ہے کہ رضیہ بازار سے جو سودا سلف لاتی ہے اس میں پیسوں کا ہیر پھیر کرتی ہے۔

رضیہ: میں ایسا نہیں کرتی، میں تو بے ایمانی کے کام نہیں کرتی۔

شمائلہ: ہم بھی تو یہی کہتے ہیں مگر نانی اماں تو بضد ہیں کہ تم سودا سلف لانے میں بے ایمانی کرتی ہو۔

رضیہ: جو انسان جیسا ہوتا ہے اسے دوسرے بھی ویسے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ بڑی اماں اپنی بیٹیوں کے گھر روٹیاں توڑتی رہتی ہیں۔ کبھی یہاں آجاتی ہیں اور کبھی ملتان چلی جاتی ہیں۔ بیٹیوں کے در پر پڑے رہنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ پھر بیٹیوں کے ہاں جا کر فرمائشی کھانے پکواتی ہیں۔ ابھی کل ہی مجھے کہہ رہی تھیں کہ گاجر کا حلوہ پکاؤ بہت دل چاہ رہا ہے۔

شمائلہ: کیا تم نانی اماں کے لیے حلوہ بناؤ گی؟

رضیہ: (دانت پیس کر) میں ایسا حلوہ بناؤں گی کی بڑی بی آئندہ گاجر کے حلوے کا نام نہیں لیں گی۔

(دانیال معنی خیز انداز میں شمائلہ کو گھورتا ہے)

دانیال: نانی اماں سے اس بات کا ذکر نہ کرنا ہم تو تمہارے خیر خواہ ہیں، ہم نے جو سنا تھا تمہیں بتا دیا۔

(پھر دانیال نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹیپ ریکارڈ کا بٹن آف کر دیا)

(ساتواں منظر)

(دانیال کا کمرہ۔ دانیال اور شمائلہ ٹیپ ریکارڈ میں رضیہ کی گفتگو سن رہے ہیں)

دانیال: اب کام بن جائے گا۔

شمائلہ: آؤ نانی اماں کے کمرے میں چلتے ہیں۔

(آٹھواں منظر)

(نانی اماں کا کمرہ۔ نانی اماں تسبیح کرنے میں مصروف ہیں۔ دونوں کو اپنے کمرے میں دیکھ کر وہ بولتی ہیں)

نانی اماں: آؤ...... آؤ...... میرے بچو آؤ۔

(دونوں بیڈ پر بیٹھ جاتے ہیں)

دانیال: (رازدارانہ انداز میں) ہم ایک بہت اہم کام کے سلسلے میں آئے ہیں۔

نانی اماں: بولو وہ اہم کام کیا ہے؟

دانیال: آپ رضیہ کو کیسا سمجھتی ہیں؟

نانی اماں: رضیہ بہت اچھی ہے۔ ایمان داری سے اپنے سارے کام کرتی ہے۔ وہ بہت محنتی اور قابل اعتماد ہے۔ رضیہ ملازمہ نہیں اس گھر کی فرد ہے۔

شمائلہ: آپ رضیہ کے بارے میں اتنے اچھے خیالات رکھتی ہیں اور رضیہ۔

(شمائلہ جان بوجھ کر خاموش ہو جاتی ہے)

نانی اماں: رضیہ نے کیا کہا ہے؟ تم چپ کیوں ہو؟

شمائلہ: رضیہ نے جو کچھ کہا ہے وہ اس ٹیپ ریکارڈ میں موجود ہے۔

نانی اماں: ٹیپ ریکارڈ میں۔

دانیال: ہاں نانی اماں ٹیپ ریکارڈ میں، رضیہ شائلہ سے باتیں کر رہی تھی کہ اتفاقاً میری جیب میں ٹیپ ریکارڈ تھا۔ میں نے اس کا بٹن آن کر دیا تا کہ رضیہ آپ کے بارے میں جو خیالات رکھتی ہے وہ آپ کو معلوم ہو سکیں۔

شائلہ: اب ٹیپ ریکارڈ چلاؤ۔

(دانیال نے ٹیپ ریکارڈ کا بٹن دبایا تو رضیہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ دانیال نے ابتدائی جملے کاٹ دیئے تھے۔ اب رضیہ کی گفتگو یوں سنائی دے رہی تھی)

رضیہ کی آواز: بڑی اماں اپنی بیٹیوں کے گھر روٹیاں توڑتی رہتی ہیں، کبھی یہاں آ جاتی ہیں اور کبھی ملتان چلی جاتی ہیں، بیٹیوں کے در پر پڑے رہنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ پھر بیٹیوں کے ہاں جا کر فرمائشی کھانے پکواتی ہیں۔ ابھی کل مجھے کہہ رہی تھیں کہ گاجر کا حلوہ پکاؤ بہت دل چاہ رہا ہے۔

دانیال: نانی اماں آپ نے سن لیا کہ رضیہ آپ کے بارے میں کیا خیالات رکھتی ہے۔

نانی اماں: (کچھ سوچ کر) تم لوگوں نے بہت بُرا کیا ہے۔

شائلہ: (حیران ہو کر) ہم نے بُرا کیا ہے؟

نانی اماں: رضیہ میرے بارے میں جو کچھ سوچتی تھی وہ صرف اس تک محدود تھا۔ تم لوگوں نے اسے ریکارڈ کر کے اچھا نہیں کیا۔ کسی کے عیبوں کو ظاہر کرنے کی بجائے اس پر پردہ ڈالنا اچھی بات ہے۔ رضیہ کی اس گفتگو کو ضائع کر دو تا کہ یہ باتیں کسی اور تک نہ پہنچ سکیں۔

دانیال: رضیہ کی باتوں سے آپ کو غصہ نہیں آیا۔

نانی اماں: یہ میرا اور رضیہ کا معاملہ ہے، رضیہ کے پاس جتنی سمجھ بوجھ ہے اس کے مطابق اس نے بات کی ہے، چلو جلدی سے یہ گفتگو ضائع کر دو، جلدی کرو۔

(اسی اثناء میں رضیہ نانی اماں کے کمرے میں آتی ہے)

رضیہ: بیگم صاحبہ آپ کے لیے گاجر کا حلوہ شام کو بناؤں یا کل؟

نانی اماں: جس طرح تمہیں آسانی ہو ویسے کر لو۔

(دانیال اور شائلہ دونوں خاموش تھے۔ ان کے دل خوف کے مارے دھک دھک کر رہے تھے۔ رضیہ کے جاتے ہی نانی اماں دوبارہ کہتی ہیں)

نانی اماں: رضیہ کی گفتگو ضائع کر دو۔

(دانیال نے فوراً رضیہ کی گفتگو ضائع کر دی۔ دونوں نانی اماں اور ٹیپ ریکارڈ کو گھور رہے تھے)

(نواں منظر)

(دانیال کا کمرہ۔ دانیال اور شائلہ سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ میز پر ٹیپ ریکارڈ رکھا ہے)

دانیال (کچھ سوچ کر) ہم نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا ہے، ہم نے سوچا تھا کہ نانی اماں ایسی باتیں سن کر یہاں سے چلی جائیں گی، ہم پھر پہلے والی ڈگر پر آ جائیں گے۔ پھر ہر وقت مزا ہی مزا ہو گا، مگر ایسا ہوا نہیں۔ نانی اماں بہت اچھی ہیں، میں نے ایسا پہلی بار دیکھا ہے کہ کوئی اپنی برائی سن کر خاموش رہا ہو۔ نانی اماں نے رضیہ کو کچھ بھی تو نہیں کہا۔

شائلہ: میرا تو سر شرمندگی سے جھکا جا رہا ہے۔ ہم اتنی اچھی نانی اماں کے بارے میں سوچ رہے ہیں کہ وہ ہمارے ہاں سے چلی جائیں۔ میں انہیں یہاں سے جانے نہیں دوں گی۔

(دسواں منظر)

(نانی اماں کا کمرہ۔ نانی اماں ایک کتاب کا مطالعہ کرنے میں مصروف ہیں۔ دونوں ان کے قدموں میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں)

نانی اماں: ارے...... ارے...... یہاں نہیں...... اوپر بیٹھو۔

دانیال: ہم اسی جگہ ٹھیک ہیں، ہم آپ سے معافی مانگنے آئے ہیں۔

نانی اماں: (کتاب بند کر کے) کیسی معافی؟

شائلہ: ہم یہ چاہتے تھے کہ آپ یہاں سے چلی جائیں تا کہ ہم پہلے والی ڈگر پر چلنے لگیں۔ اس لیے ہم نے رضیہ سے یہ کہا تھا کہ آپ نے ماما کو کہا ہے کہ رضیہ سودا سلف

لانے میں بے ایمانی کرتی ہے، ہمارا یہ کہنا تھا کہ رضیہ نے وہ کچھ کہا جو آپ نے ٹیپ ریکارڈ میں سنا تھا۔

نانی اماں: اچھا یہ معاملہ ہے، تم لوگوں نے بہت بُرا کام کیا ہے، رضیہ تو نہایت ایمان دار ہے، تم نے مجھ سے کہا ہوتا میں خود یہاں سے چلی جاتی، میں اب یہاں نہیں رہوں گی، میں جا رہی ہوں۔

دانیال، شمائلہ: (یک زبان ہو کر) ہم آپ کو یہاں سے نہیں جانے دیں گے۔ ہم آپ کی ہر بات پر عمل کریں گے۔ آپ ہم سے ناراض ہو کر مت جائیں۔

نانی اماں: (دونوں کو گلے سے لگاتے ہوئے) اچھا میرے بچو، اچھا میرے بچو۔

دانیال: (نعرہ لگاتے ہوئے) ہماری نانی اماں۔

شمائلہ: (نعرے کا جواب دیتے ہوئے) زندہ باد۔

([illegible])

(ڈرائنگ روم کا منظر: شام کا وقت ہے۔ دانیال، شمائلہ، امی، ابو اور نانی اماں وہاں موجود ہیں۔ ابو جان دونوں کے رزلٹ کارڈز دیکھ رہے ہیں۔ ان کے چہرے پر خوشی ہے)

ابو جان: ویل ڈن، بہت شان دار رزلٹ ہے۔

دانیال: اتنا اچھا رزلٹ نانی اماں کی وجہ سے آیا ہے۔ اب ہم ان کے بنائے ہوئے ٹائم ٹیبل کے مطابق پڑھتے اور کھیلتے ہیں۔ ہم پہلے زیادہ وقت کھیل کود میں ضائع کرتے تھے اس لیے رزلٹ اچھا نہیں آتا تھا۔ شکریہ نانی اماں شکریہ۔

نانی اماں: ایسا تم لوگوں کی محنت کی وجہ سے ہوا ہے۔ میرا کام یہاں مکمل ہو گیا ہے، میں اب یہاں زیادہ دن نہیں ٹھہروں گی۔

دانیال: ہم آپ کو یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔

نانی اماں: (دانیال کو پیار کرتے ہوئے) میں تمہاری امی جان کے کہنے پر یہاں آئی تھی۔ میں جب پچھلے سال یہاں آئی تھی تو تم دونوں کا رزلٹ اچھا ہو گیا تھا مگر میرے یہاں سے جاتے ہی تم دونوں پڑھائی کی بجائے کھیل کود میں زیادہ مصروف ہو گئے تھے جس کے باعث تمہارا رزلٹ پھر خراب ہو گیا تھا۔ اب میں یہاں سے جاؤں تو تم نے میرے بنائے ہوئے ٹائم ٹیبل کے مطابق پڑھائی اور کھیل کو وقت دینا ہے۔ ملتان میں تمہارے خالہ زاد دانش اور رضا میرے منتظر ہیں۔ میں پرسوں یہاں سے چلی جاؤں گی۔

(یہ سن کر دونوں اُداس ہو گئے)

(پانچواں منظر)

(دانیال کا کمرہ۔ وہ ایک کتاب پڑھنے میں مصروف ہے۔ شمائلہ امی جان کے ساتھ کمرے میں آتی ہے۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔)

دانیال: (کتاب ایک طرف رکھ کر) کیا ہوا ہے؟

شمائلہ: دانیال بھائی وہ......

دانیال: وہ کیا؟

شمائلہ: وہ دانیال بھائی نانی اماں کا ملتان میں انتقال ہو گیا ہے۔

(یہ کہہ کر امی جان اور شمائلہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہیں)

دانیال: انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شمائلہ: نانی اماں اب کبھی ہمارے ہاں نہیں آئیں گی۔

دانیال: وہ یہاں سے گئی کب ہیں جو یہاں آئیں گی، نانی اماں اپنی اچھی باتوں کے ذریعے ہمارے درمیان ہیں اور رہیں گی۔ اچھے اور نیک لوگ ظاہری طور پر تو اس دُنیا سے چلے جاتے ہیں مگر اپنے اچھے کاموں اور اچھی باتوں کی صورت میں ہمیشہ کے لیے انسانوں کے درمیان موجود رہتے ہیں۔

امی جان: تمہیں یہ سب باتیں کس نے بتائی ہیں؟

دانیال: نانی اماں نے، نانی اماں نے ہمیں نیکی کے جس راستے پر چلایا ہے ہم اُسی پر چلیں گے۔

امی جان: واقعی تمہاری نانی اماں تمہیں بتائی ہوئی اچھی باتوں کی صورت میں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گی۔

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ قرآن مجید کی سب سے چھوٹی سورۃ کون سی ہے؟

i۔ سورۃ الناس ii۔ سورۃ الکوثر iii۔ سورۃ الفلق

2۔ سیرت رسول ﷺ پر لکھی کتاب "انسان کامل" کے مصنف کا نام کیا ہے؟

i۔ خالد غزنوی ii۔ مولانا غلام رسول مہر iii۔ چراغ حسن حسرت

3۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کو کس نام سے پکارا جاتا ہے؟

i۔ صبر القصص ii۔ احسن القصص iii۔ یوسف القصص

4۔ وائٹ ہاؤس کا سنگِ بنیاد کب رکھا تھا؟

i۔ 1794ء میں ii۔ 1798ء میں iii۔ 1792ء میں

5۔ کس مشہور کرکٹر کو "کنگ آف دی فیلڈ" کا خطاب دیا گیا؟

i۔ جاوید میاں داد ii۔ سرگیری سوبرز iii۔ ڈان بریڈ مین

6۔ گوجرانوالہ کا پرانا نام کیا ہے؟

i۔ خان گڑھ ii۔ خان پور iii۔ گجر پورہ

7۔ سعودی عرب کا معروف انگریزی اخبار "عرب نیوز" کس شہر سے شائع ہوتا ہے؟

i۔ ریاض ii۔ طائف iii۔ جدہ

8۔ امریکہ کا قومی کھیل کون سا ہے؟

i۔ بیس بال ii۔ والی بال iii۔ فٹ بال

9۔ انسانی جسم میں کرومیم کی کمی سے کس چیز کی تیاری میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے؟

i۔ آئرن ii۔ کیلشیم iii۔ انسولین

10۔ مغل دورِ حکومت میں کس زبان کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا؟

i۔ اردو ii۔ انگریزی iii۔ فارسی

جوابات علمی آزمائش مارچ 2012ء

1۔ سورۃ البقرہ 2۔ سرکار مدینہ 3۔ 150 دن 4۔ تھرمامیٹر 5۔ وینس 6۔ عبداللطیف کاردار 7۔ لشکر 8۔ خان گڑھ 9۔ ہاکی 10۔ کرنل الٰہی بخش۔

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ حافظ فریحہ لطیف، گوجرانوالہ (200 روپے کی کتب)

☆ زاہد محمود، میرپور (175 روپے کی کتب)

☆ عریج شہزاد، اسلام آباد (125 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی:

☆☆ ایمان فاطمہ، راولپنڈی۔ محمد فیضان عتیق، اسلام آباد۔ محمد زبیر ارشد، ملتان۔ محمد شفیق الرحمن اسلم، میرپور۔ قمر ناز دہلوی، کراچی۔ آمنہ مظہر، امجد جاوید، راولپنڈی۔ فاطمہ امام، لاہور۔ حسن رضا سردار، سلمان علی قادری، فریاد علی قادری، ذیشان ذوالفقار قادری، کاموکی۔ انصر صابر، بہاری۔ سید اشہد بخاری، بھکر۔ تحریم آرش، بہاول پور۔ عبداللہ محمود، لاہور۔ عبدالواسع، راولپنڈی۔ رابعہ لائق، فیصل آباد۔ شفق رضا، لاہور۔ عشاء فاروق، جھنگ۔ محمد اسامہ بن شاہد، لاہور۔ محمد حسن، کراچی۔ نمرہ شاہین، سرگودھا۔ اُم حبیبہ، جہلم۔ اسامہ اسلم، سرگودھا۔ سارہ احمد، ٹیکسلا۔ محمد عثمان عابد، بہاول پور۔ سیدہ حسنہ احسان، معاذ احمد، لاہور۔ اقراء بشیر جکوک، واہ کینٹ۔ محمد سلمان حمید، گوجرانوالہ۔ سیماب آصف، ساہی وال۔ عاطف نیک، عون عثمان، عفان عثمان، رائے محمد عتیق، شیخوپورہ۔ حماد احمد آتش، اٹک۔ عبداللہ سلیم، فیصل آباد۔ اریبا آفتاب، کراچی۔ سدرۃ المنتہیٰ، فیصل آباد۔ محمد اسامہ حنیف، کراچی۔ کومل صادق، گوجرانوالہ۔ محمد معید حیدر مرزا، راولپنڈی۔

برکت

محمد طارق

''اس نامراد کو بھی ابھی پنکچر ہونا تھا......!'' میں نے جھنجھلاہٹ میں موٹر سائیکل کو ایک زوردار لات ماری اور پھر خود ہی اپنا پاؤں پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میں نے موٹر سائیکل وہیں سڑک کے کنارے ڈبل اسٹینڈ پر کھڑی کی اور کیل تلاش کرنے لگا۔ دوپہر کا وقت اور گرمی کا موسم تھا۔ سورج صاحب دل کھول کر آگ برسا رہے تھے اور تارکول کی سڑک بھی تانبے کی طرح تپ رہی تھی۔

کیل صاحب خاصے قد کاٹھ کے مالک تھے اور نوکیلے بھی، میرا دل ڈوبنے لگا۔ نہ جانے ٹیوب پر کیا بیتی ہوگی۔ اسی پریشانی کے عالم میں گھڑی پر وقت دیکھا، اڑھائی بج رہے تھے۔ نواحی بستی سے شہر کی طرف جانے والا یہ روڈ بالکل سنسان تھا۔

''نہ جانے پنکچر شاپ کتنی دُور ہوگی۔ پتہ نہیں یہ کون لوگ ہیں جو راستوں پر کیل کانٹے بکھیر دیتے ہیں۔ ذرا احساس نہیں کرتے کہ ان کیلوں کی وجہ سے مسافروں کو کتنی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔'' میں یونہی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا، موٹر سائیکل کو گھسیٹتا شہر کی جانب بڑھنے لگا۔ شہر یہاں سے کم از کم تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

جلد ہی رب کریم کو میری حالت پر رحم آ گیا۔ ابھی ڈیڑھ دو فرلانگ کا فاصلہ ہی طے کیا تھا سڑک کنارے اُگے پیپل کے درخت کے نیچے ایک ٹائر شاپ دکھائی دی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ بابو برکت ٹائر شاپ کے بورڈ کے پاس ہی پرانے ٹائروں کے ڈھیر کے پہلو میں ایک شخص سائیکل کو پنکچر لگانے میں مصروف تھا۔

''بابو جی! کیا موٹر سائیکل کو بھی پنکچر لگا دو گے......؟'' میں نے پوچھا۔

''موٹر سائیکل کیا چیز ہے جناب آپ ہوائی جہاز لے آؤ اس کو بھی پنکچر لگا دیں گے!'' بابو برکت نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا پھر گویا انکشاف کرتے ہوئے بولے: ''سائیکل ہو، موٹر سائیکل ہو، موٹر کار ہو یا ہوائی جہاز، باؤ جی! ٹائر تو سب کے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔''

بابو برکت کا فلسفہ سن کر میں نے بھی مسکراتے ہوئے آہستگی سے سر ہلا دیا اور درخت کی گھنی چھاؤں میں ایک سٹول پر بیٹھ گیا۔ بابو برکت کے شاگرد نے مٹی کے پیالے میں مٹکے کا ٹھنڈا پانی مجھے پیش کیا جسے پی کر زبان بے اختیار اللہ پاک کی اس عظیم نعمت کا شکر ادا کرنے لگی۔

سائیکل کو پنکچر لگانے کے بعد بابو برکت میری بائیک کی طرف متوجہ ہوا تو میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''بھائی برکت! پنکچر لگانے سے پہلے اچھی طرح چیک کر لینا! اگر پنکچر دو ہوں تو پنکچر لگا دینا، زائد ہوں تو رہنے دینا پھر میں ٹیوب ہی نئی ڈلوا لوں گا!''

''باؤ جی! آپ فکر ہی نہ کریں۔''

''بھائی برکت ایک پنکچر کے کتنے پیسے لو گے......؟''

''سائیکل کے پندرہ اور موٹر سائیکل کے بیس روپے فی پنکچر......!'' یہ سن کر میں خاموش رہا، لیکن بابو برکت کو تو ایک موضوع ہاتھ آ گیا تھا۔ وہ بولتا رہا۔

''باؤ جی! کیا کریں! مہنگائی نے ناک میں دم کیا ہوا ہے۔ سارا سارا دن محنت سے کام کرتا ہوں۔ لیکن خرچے ہیں کہ پورے ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ نہ جانے کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ پرانے

وقتوں کے لوگ بڑے سکھی تھے۔ ایک کماتا تھا اور گھر کے آٹھ دس افراد کھاتے تھے۔ اور آج گھر کے سارے افراد کمانے میں لگے ہوئے ہیں لیکن خرچے پورے ہی نہیں ہوتے۔ نہ جانے کہاں جا کر رکے گی یہ مہنگائی......!"

زبان کے ساتھ ساتھ بابو برکت کے ہاتھ بھی پوری مستعدی سے چل رہے تھے۔ اب تک وہ ٹائر کھول کر ٹیوب باہر نکال چکا تھا اور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا:

برکت صاحب! آپ تو پھر مزدور طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے تو لاکھوں روپیہ ماہوار کمانے والے تاجروں اور نوکری پیشہ لوگوں کو بھی یہی شکوہ کرتے سنا ہے کہ مہنگائی بہت زیادہ ہے خرچے پورے نہیں ہوتے۔ میرے خیال میں خرچے پورے نہ ہونے کا سبب مہنگائی سے زیادہ بے برکتی ہے۔"

"آپ اسے کچھ بھی کہہ لیں باؤ جی! یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ جتنی مرضی کوشش کرلو خرچے پورے نہیں ہوتے۔" بابو برکت نے گویا حتمی فیصلہ سنا دیا۔ پھر ٹیوب دکھاتے ہوئے بولا۔ "لو جی! چیک کرنے کی ضرورت ہی نہیں، یہ دو موٹے موٹے سوراخ سامنے ہی نظر آ گئے ہیں۔ لگتا ہے بڑا ظالم کیل تھا۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ ٹیوب کو پنکچر لگانے میں مصروف ہو گیا۔ ذرا سی دیر میں یہ کام بھی مکمل ہو گیا۔ اس نے پھر ٹیوب میں ہوا بھری اور پانی کے ٹب میں ڈال کر چیک کرنے لگا۔ پھر فکرمندی سے بولا: "باؤ جی یہ دو باریک باریک پنکچر اور نکل آئے ہیں، لیکن آپ فکر نہ کریں میں بہترین طریقے سے پنکچر لگا دوں گا۔ ٹیوب ابھی بالکل نئی ہے۔ کام اے ون ہو جائے گا۔"

دو پنکچر نکل جانے کے بعد اب میں کیا کہہ سکتا تھا۔ پھر بابو برکت دوبارہ پنکچر لگانے میں مصروف ہو گیا۔ اور میں خاموشی سے اسے کام کرتے دیکھتا رہا۔ پنکچر لگانے کے بعد ایک مرتبہ پھر ٹیوب میں ہوا بھر کر اسے پانی بھرے ٹب میں ڈبو کر چیک کیا گیا۔ مزید دو نئی جگہوں سے پانی کے بلبلے نکلنے لگے۔ تب میں چیخا: "یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ......!"

"او جی کیل بھی تو دیکھیں کتنا ظالم تھا۔ بڑے باریک پنکچر ہیں۔ ہوا ٹائٹ بھری ہے تو ظاہر ہوئے ہیں۔ شکر کریں ان کا پتہ چل گیا ورنہ خواہ مخواہ آپ پریشان ہوتے۔" بابو برکت نے میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا۔ وہ اب پانچواں اور چھٹا پنکچر لگانے میں مصروف تھا۔

پانچواں اور چھٹا پنکچر لگانے کے بعد ساتواں اور آٹھواں پنکچر بھی دریافت ہو گیا، لیکن میرے غصیلے تیوروں کو دیکھتے ہوئے بابو برکت نے پہلے ہی کہہ دیا۔ باؤ جی آپ فکر نہ کریں۔ اب چاہے سو پنکچر بھی نکل آئیں میں آپ سے زائد پنکچروں کے پیسے نہیں لوں گا۔ آپ صرف چھ پنکچروں کے ہی پیسے دے دینا۔ اب میں کیا کہہ سکتا تھا۔ بس غصے اور حیرت سے بابو برکت کی کاری گری دیکھتا رہا۔ فقط آٹھ پنکچروں پر ہی کام مکمل ہو گیا۔ چھ پنکچروں کے ایک سو بیس روپے بنے تھے جبکہ نئی ٹیوب کی قیمت ایک سو نوے روپے تھی۔ پیسے پکڑاتے ہوئے میں نے بابو برکت سے کہا۔

"بابو جی! ایک بات تو بتاؤ......؟ اگر دودھ سے بھری کڑاہی میں محض ایک چھپکلی گر جائے تو کیا ہوگا؟"

"ظاہر ہے جی! سارا دودھ زہریلا اور ناپاک ہو جائے گا۔ دودھ کو نالی میں بہانا پڑے گا۔"

"اور اگر خون پسینہ بہا کر کمائی گئی حلال کی روزی میں تھوڑا سا بھی حرام کا پیسہ شامل ہو جائے تو......؟" میں نے اگلا سوال کیا تو بابو برکت چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ تب میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"اسی لیے ہمارے خرچے پورے نہیں ہوتے۔ ہم خود اپنے ہاتھوں سے حلال کی روزی میں بدنیتی کے پنکچر لگاتے رہتے ہیں۔ اور انہی سوراخوں سے ہماری حلال کی کمائی بھی ہوا کی طرح اڑ جاتی ہے۔ آپ اسے مہنگائی اور بے روزگاری کہتے ہیں، ہمارا دین اسے بے برکتی کہتا ہے۔ یاد رکھنا! بعض اوقات یہ سوراخ اتنے بڑے ہو جاتے ہیں کہ ان میں سے برکت کے ساتھ ساتھ ایمان کی دولت بھی نکل جاتی ہے۔"

اپنی بات مکمل کر کے میں نے بابو برکت کے چہرے پر نظر دوڑائی۔ وہاں گہری سوچ کے آثار تھے۔ میں نے موٹر سائیکل کو گیئر میں ڈالا اور بابو برکت کو سوچوں کے حوالے کر کے آگے بڑھ گیا۔

گھڑی پر رات کے دو بجے تھے۔ عمر لیٹا تو اپنے بیڈ پر ہوا تھا مگر اس کی نظر اپنے کمرے کے دروازے پر تھی۔ اس نے کمرے کا دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ڈولی اپنی سہیلی بچی سے ملنے گئی ہوگی اور وہ رات کے کسی پہر واپس آجائے گی۔ دو سے تین بج گئے مگر ڈولی نہ آئی۔ عمر کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ اپنی کتابوں کی شیلف کی طرف [illegible] شیلف میں رکھی ایک ایک کتاب کو [illegible]

"ہاں تم بتاؤ [illegible]"

عمر کا سوال [illegible] منی خاموش ہی رہی۔

"سونی [illegible] بتاؤ ڈولی کہاں گئی ہے؟" عمر نے منی سے مایوس ہو کر شیلف میں رکھی ایک اور کتاب سونی کو مخاطب کیا۔

"اچھا تو تم بھی مجھے کچھ نہیں بتاؤ گی۔"

اسی اثناء میں کتابیں ہلنا شروع ہوئیں۔ عمر نے جان لیا کہ یہ آپس میں باتیں کر رہی ہیں۔

"تم مجھے کچھ مت بتاؤ، میں جب ڈولی سے منتر معلوم کر لوں گا تو پھر میں تم سب کی باتیں آسانی سے سن سکوں گا۔" عمر نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

وہ دوبارہ اپنے بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ اُس پر ایک ایک لمحہ بھاری گزر رہا تھا۔ اُس نے تمام رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ صبح ہونے تک ڈولی کا کچھ پتہ نہ تھا۔ ساری رات جاگنے کے باعث اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ سکول جاتے ہوئے عائشہ نے سوال کیا۔

"بھیا! لگتا ہے آپ ساری رات جاگتے رہے ہیں۔"

"ہاں ایسی ہی بات ہے۔" عمر نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"رات بھر جاگنے کی کوئی وجہ بھی تو ہوگی۔"

"وہ ڈولی نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔" عمر نے اداس لہجے میں کہا۔

"ڈولی کہیں چلی گئی ہے۔" عائشہ نے دہرایا۔

"ہاں کل رات وہ میز پر پڑی تھی کہ اچانک غائب ہوگئی، میں رات بھر اس کے آنے کا انتظار کرتا رہا جس کے باعث میں سو بھی نہ سکا۔"

"اگر ڈولی نہ آئی تو پھر منتر بھی معلوم نہ ہو سکے گا۔ ہم گھر واپس جا کر دونوں ڈولی کو تلاش کریں گے، مجھے اُمید ہے ڈولی مل

جائے گی۔" عائشہ نے عمر کو تسلی دی۔

"نہ جانے ڈولی کہاں ہے اور کب واپس آئے گی۔" عمر کے لہجے میں مایوسی تھی۔

عمر سکول میں سارا وقت اداس رہا۔ سائنس کا ٹیسٹ نہ ہوتا تو شاید وہ آج سکول بھی نہ جاتا۔ اُس نے بہت مشکل سے ٹیسٹ دیا تھا۔ رات بھر جاگنے کے باعث اُس کو ہلکا ہلکا بخار بھی ہو گیا تھا۔ سکول سے چھٹی کے بعد وہ گل خان اور عائشہ کے ساتھ ناول بک سٹال گیا۔ ڈولی کی سہیلی چنکی ناول بک سٹال میں ہوتی تھی۔ عمر نے جلد ہی ایک شیلف میں چنکی کو ڈھونڈ لیا۔

"عائشہ! یہی چنکی ہے۔" عمر نے ایک کتاب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اچھا یہ ڈولی کی سہیلی ہے، اس کو پتا ہو گا کہ ڈولی کہاں ہے؟" عائشہ نے چنکی کو شیلف سے نکالتے ہوئے کہا۔

"چنکی! میں عمر ہوں، ڈولی میری کہانیوں کی پیاری کتاب ہے، وہ رات سے کہیں غائب ہے، کیا وہ تمہارے پاس آئی تھی؟"

"بولو چنکی، تم خاموش کیوں ہو؟" عائشہ بھی بول پڑی۔

کچھ فاصلے پر ایک آدمی کھڑا تھا۔ وہ بار بار ان کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس سے باتیں کر رہے ہیں۔

"عائشہ! چلو یہ نہیں بولے گی۔" عمر نے اتنا کہا تو چنکی بولی:

"عمر! چنکی تو یہاں نہیں آئی۔"

"تو پھر وہ کہاں جا سکتی ہے؟" عمر نے چنکی کی بات درمیان سے اچک لی۔

"میرا خیال ہے کہ وہ روشن لائبریری گئی ہو گی، اُس لائبریری میں ہم دونوں کی ایک بہت اچھی سہیلی چمکیلی ہوتی ہے، جب تم سکول یا کسی اور جگہ جاتے ہو تو ڈولی اکثر چمکیلی کو ملنے جاتی ہے، میرا خیال ہے وہ اب بھی چمکیلی کو ملنے گئی ہو گی۔" چنکی بولتی چلی گئی۔

"روشن لائبریری کہاں ہے؟" عائشہ نے سوال کیا۔

"گولڈن پلازہ کے ساتھ ایک سڑک بائیں طرف مڑتی ہے اس سڑک کے آخر میں روشن لائبریری ہے، تمہیں وہاں جانا چاہیے۔" عمر چنکی کا شکریہ ادا کر کے ناول بک سٹال سے باہر آ گیا۔

جب اُس نے گل خان سے روشن لائبریری جانے کے لیے کہا تو گل خان بولا۔

"میں نے تم لوگوں کو گھر چھوڑ کر بڑے صاحب کو لینے جانا ہے، آج اُن کی ایک اہم میٹنگ ہے۔ اگر دیر ہو گئی تو وہ ناراض ہوں گے، میں کل تمہیں روشن لائبریری لے جاؤں گا، اب ہمیں گھر چلنا چاہیے۔"

"میں آج شام ضرور روشن لائبریری جاؤں گا، ڈولی کے بغیر میرا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا، میں ڈولی کو تلاش کروں گا۔" عمر نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

شام کے وقت وہ امی جان کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ روشن لائبریری میں جانا چاہتا تھا۔ عمر کے ٹیوٹر کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ عمر کی ضد دیکھ کر امی جان نے پوچھا۔

"تم روشن لائبریری کیوں جانا چاہتے ہو؟"

"مجھے وہاں ایک ضروری کام ہے پلیز امی مجھے وہاں جانے کی اجازت دے دیں۔"

"میں تمہیں روشن لائبریری جانے کی اجازت تبھی دوں گی جب تم مجھے بتاؤ گے کہ تمہیں روشن لائبریری میں کیا کام ہے۔"

امی جان کی بات سن کر عمر خاموش ہو گیا۔ وہ امی جان کو ڈولی کے بارے میں بتانا تو نہیں چاہتا تھا مگر اب کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔

"وہ امی جان......!" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں...... ہاں بولو چپ کیوں ہو گئے۔"

"وہ امی میں دراصل روشن لائبریری اپنی کہانیوں کی کتاب ڈولی کو تلاش کرنے جا رہا ہوں، میری ڈولی کہیں چلی گئی ہے۔"

"ڈولی، کہانیوں کی کتاب، کہیں چلی گئی ہے۔" یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" امی جان نے حیرت میں گم عمر کی طرف دیکھا۔

"امی جان! ڈولی باتیں بھی کرتی ہے۔" عائشہ کے انکشاف پر امی جان مزید حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگیں۔

"یہ تم دونوں کیسی باتیں کر رہے ہو، کتابیں اور باتیں، یہ سب کیا ہے؟"

''امی جان! عائشہ ٹھیک کہہ رہی ہے، ڈولی بھی بولتی ہے اور اس کی سہیلیاں بھی بولتی ہیں، جس رات میں خوف زدہ ہوا تھا۔ تب ڈولی کی سہیلی چنچی ہی تو اُسے ملنے میرے کمرے میں آئی تھی، چنچی ہی میرے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ اب تو میں بھی ڈولی سے باتیں کر لیتا ہوں۔ میں اگر اچھا بچہ بن گیا تو ڈولی مجھے ایسا منتر بتائے گی جس کے پڑھنے سے میں ہر چیز کو باتیں کرتے سن سکوں گا۔'' امی جان حیرت سے منہ کھولے عمر کو تک رہی تھیں۔

''میں تمہاری باتوں پر یقین نہیں کر سکتی، جو تم کہہ رہے ہو وہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''امی جان! ہم نے آپ کو جو بتایا ہے وہ بالکل سچ ہے۔'' عائشہ بولی۔

''جادو کی کہانیاں پڑھنے والے بچوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت جادو کی دُنیا میں کھوئے رہتے ہیں، آ جاؤ جادو کی نگری سے باہر۔''

''امی جان! یہ جادو نہیں، ہم حقیقت کی بات کر رہے ہیں۔ جب ڈولی مل جائے گی تو آپ کو ہماری باتوں کا یقین آ جائے گا۔ مجھے ڈولی کی تلاش کے لیے روشن لائبریری جانے کی اجازت دے دیں۔'' عمر کی بات سن کر امی جان بولیں۔

''میں بھی تمہارے ساتھ روشن لائبریری جاؤں گا۔''

''اور میں بھی ساتھ چلوں گی۔'' عائشہ بھی بول پڑی۔

شام کے وقت وہ روشن لائبریری میں موجود تھے۔ اب وہاں مسئلہ یہ تھا کہ چمکیلی کو کس طرح تلاش کیا جائے۔ عمر کتابوں کی الماریوں کے پاس جا کر نہایت دھیمی آواز میں پکار رہا تھا۔

''کس سے چمکیلی کون ہے؟''

وہ بار بار یہ جملہ دھرا رہا تھا۔ آخری کونے میں رکھی ایک الماری سے آواز آئی۔

''میرا نام چمکیلی ہے۔''

امی جان اور عائشہ نے بھی یہ آواز سنی تھی۔

''چمکیلی! میں عمر ہوں، میں یہاں ڈولی کی تلاش میں آیا ہوں، بتاؤ ڈولی کہاں ہے؟''

''اچھا تو تم عمر ہو۔'' چمکیلی کی بات سن کر عمر نے فوراً پوچھا۔

''کیا تم مجھے جانتی ہو؟''

''ہاں ڈولی اکثر تمہارا ذکر کرتی ہے۔''

''ڈولی اب کہاں ہے؟'' عمر کی زبان پر تو صرف ایک ہی سوال تھا۔

''مجھے کیا معلوم، وہ ایک ماہ پہلے مجھے ملنے آئی تھی، اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔'' چمکیلی کی بات سن کر عمر مایوس ہو گیا۔

عمر کو ڈولی کے ملنے کی جو اُمید پیدا ہوئی تھی وہ بھی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ امی جان کو بھی یقین آ گیا تھا کہ عمر اور عائشہ نے انہیں جو باتیں بتائی تھیں وہ جادوگری کی نہیں حقیقی دُنیا کی باتیں تھیں۔ ڈولی کو غائب ہوئے دو دن ہو گئے تھے۔ عمر کو کسی پل ڈولی کے بغیر چین نہ تھا۔ اُس کا کسی کام کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُسے ڈولی مل جائے۔ وہ ڈولی کے بغیر اس قدر پریشان ہوا کہ شام کے وقت اُسے بخار ہو گیا۔ اُس کا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ امی جان اور عائشہ اس کے سرہانے کھڑی تھیں۔ ابو جان کاروبار کے سلسلے میں کراچی گئے ہوئے تھے۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں عمر کی زبان پر ڈولی کا نام تھا۔ عمر کی طبیعت زیادہ خراب ہونے پر امی جان اُسے لے کر ہسپتال جانے لگیں تو دروازے پر ایک پھٹی پرانی سی کہانیوں کی کتاب پڑی تھی۔ اُس کی حالت بہت خراب تھی۔

''ارے یہ تو ڈولی ہے۔'' عائشہ کی یہ بات سن کر عمر نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے بُری حالت میں ڈولی موجود تھی۔

''میری ڈولی...... میری ڈولی...... تم کہاں چلی گئی تھی؟ میری ڈولی بتاؤ تم اب تک کہاں تھی؟'' عمر نے یہ کہتے ہوئے بے اختیار اپنی کہانیوں کی کتاب ڈولی کو چوم لیا۔

(ڈولی کہاں سے آئی تھی، اُس کے ساتھ کیا بیتی تھی، یہ جاننے کے لیے اگلی قسط پڑھیے۔)

صرف تین گھنٹے

نذیر انبالوی

گھر کے تمام افراد ٹیلی ویژن پر نظریں جمائے نائمہ کی شادی کی فلم دیکھ رہے تھے۔ فلم دیکھتے ہوئے وہ لوگوں کے کپڑوں پر بھرپور انداز میں تبصرہ بھی کر رہے تھے۔ نائمہ جب اسٹیج کی طرف بڑھی تو ماہم نے اُس کا لہنگا دیکھتے ہوئے کہا۔

''واہ! کتنا خوب صورت ہے یہ لہنگا۔''

''واقعی میں نے اپنے خاندان میں اس سے پہلے اتنا خوب صورت اور مہنگا لہنگا پہنے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا، نائمہ کی امی جان نے بتایا تھا کہ اُس نے نوے ہزار روپے میں یہ لہنگا خریدا تھا۔'' ماہم کی امی نجمہ کی بات سن کر جنید نے دہرایا۔

''نوے ہزار روپے کا لہنگا۔''

''یہ تو درمیانے درجے کا لہنگا ہے، اب تو بات لاکھوں روپوں تک پہنچ چکی ہے، چھ ماہ پہلے مبارک صاحب کی بیٹی نے ایک لاکھ بیس ہزار روپے کا لہنگا خریدا تھا۔''

''امی...... امی...... چچی کو دیکھیں۔'' ایک منظر دیکھ کر ماہم چلائی۔

''کیا ہوا ہے تمہاری چچی کو؟''

''چچی کا سوٹ دیکھیں۔''

''دیکھ لیا ہے راحیلہ کا سوٹ۔'' امی نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

''یہ سوٹ چچی نے مبارک صاحب کی بیٹی کی شادی میں بھی پہنا تھا۔''

''یہ سوٹ تو راحیلہ نہ جانے کتنی شادیوں میں پہن چکی ہے، کنجوس، مکھی چوس، پیسے خرچ کرتے ہوئے تو راحیلہ کی جان جاتی ہے، اسے اپنی عزت کا تو کچھ خیال نہیں کم از کم ہماری عزت کا ہی خیال کرلیا کرے۔''

''بیگم! اب بس بھی کرو، آرام سے فلم تو دیکھنے دو۔'' کاشف نے کہا۔

''میں جو کہہ رہی ہوں کیا وہ غلط ہے، آپ کا بھائی بھی کنجوسی میں کچھ کم نہیں، دونوں میاں بیوی بے حد کنجوس ہیں، اتنی اہم شادی تھی اور پہن لیے وہی پرانے کپڑے، یہ اتنا پیسہ لے کر نہ جانے کہاں جائیں گے، اللہ تعالیٰ پیسے دے تو خرچ کرنے کی ہمت بھی دے۔''

''امی جان! کیوں فلم کا مزا کرکرا کر رہی ہیں، خاموش ہو جائیں۔'' جنید بولا۔

''لو، اب اپنے چچا جان آصف کو بھی دیکھ لو، وہی پرانا سوٹ، بیسوں شادیوں میں یہ سوٹ پہن چکا ہے، سب بدل جائیں گے، مگر یہ لوگ نہیں بدلیں گے۔'' جب تک فلم چلتی رہی نجمہ کا تبصرہ جاری رہا۔

گلشن کالونی میں تین مرلے کے ایک مکان کے نچلے حصے

میں کاشف اپنی بیوی بچوں کے ساتھ جب کہ اُوپر والے حصے میں اُس کا چھوٹا بھائی آصف اپنے خاندان کے ساتھ رہتا تھا۔ کاشف کے دو لڑکے اور ایک لڑکی جب کہ آصف کی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ خاندان یا محلے میں جو شادی بھی ہوتی کاشف اور اُس کی بیگم کی یہی کوشش ہوتی کہ اس شادی کی سی ڈی حاصل کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ شادی میں کس نے کس طرح کا لباس پہنا تھا۔ پھر سارے گھر والے مل کر وہ فلم دیکھتے اور لوگوں کے لباس کے بارے میں خوب تبصرے کرتے۔

اتوار کی شام نجمہ کا چچا برکت ان کے گھر آیا۔ اُس نے دو کارڈ کاشف کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لو کاشف میاں، یہ دانیال بیٹے اور شازیہ کی شادی کے کارڈ ہیں، ایک کارڈ تمہارا ہے اور ایک آصف کا ہے۔''

''چچا جان! یہ اچانک شادی کا پروگرام کس طرح بن گیا ہے؟'' کاشف نے کارڈ لیتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں تو پتا ہے کہ شازیہ کی منگنی ایک سال پہلے ہوئی تھی، لڑکا سعودی عرب سے ایک ماہ کی چھٹی پر آ رہا ہے اس لیے ہم نے اتنی عجلت میں شادی کی تاریخ طے کی ہے، دانیال کے سسرال والے بھی جلد شادی کے خواہش مند تھے اس لیے یہ طے پایا کہ دانیال کے ولیمے والے دن شازیہ کی بارات آئے گی۔'' چچا برکت نے تفصیل بتائی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' کاشف بولا۔

شازیہ اور دانیال کی شادی [illegible] پر کاشف اور اس کی بیوی [illegible] شروع کر دیں۔ دانیال اور شازیہ کی [illegible] تقریب الگ الگ دنوں میں ہوئی تھی [illegible] نے اس تقریب کے لیے دو دو خصوصی سوٹ سلوائے تھے۔ دانیال کی بارات اور ولیمے کے لیے کاشف اور اُس کے بیٹوں جنید اور سلطان نے دو دو تو پیس سلوائے جب کہ نجمہ اور ماہم نے مہنگے ترین کڑھائی والے ملبوسات اور مہنگے جوتوں کا انتخاب کیا تھا۔ پندرہ دنوں ہی میں ان کی تیاری مکمل ہو گئی تھی۔ نجمہ اپنے چچازاد بھائی اور بہن کی شادی میں بھرپور شرکت کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے گولڈن رنگ کے جس سوٹ کا انتخاب کیا تھا اُس کی قیمت دس ہزار روپے تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ سب اس کے سوٹ کی تعریف کریں۔ وہ اب تک شادی کے ملبوسات کے لیے پچاس ہزار روپے خرچ کر چکے تھے۔

ایک دوپہر نجمہ سبزی کاٹ رہی تھی کہ آصف کی بیگم راحیلہ گھر میں داخل ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں نیلے رنگ کا ایک شاپنگ بیگ تھا۔

''راحیلہ! کہاں گئی تھی؟'' نجمہ نے پوچھا۔

''بھابھی! بازار گئی تھی۔ شائلہ اور ندا کے کپڑوں کے لیے کالی لیس لینے گئی تھی۔''

''اچھا تو شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔''

''جی بھابھی!'' راحیلہ بولی۔

''شادی پر کوئی ڈھنگ کے کپڑے پہن کر جانا، میرے چچا کے بیٹے اور بیٹی کی شادی ہے، شادی میں پرانے کپڑے پہن کر مت جانا۔'' نجمہ کے لہجے میں تلخی نمایاں تھی۔

''بھابی! یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں، ہم جہاں بھی جاتے ہیں اچھے کپڑے ہی پہن کر جاتے ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے جیسے کپڑے پہن کر تم لوگ جاتے ہو، صدیوں پرانے کپڑے پہن کر چلے جاتے ہو، نائمہ کی شادی میں

بھی تم دونوں اور بچے پرانے کپڑے پہن کر گئے تھے۔'' نجمہ نے راحیلہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

''جن کپڑوں کو آپ پرانا کہہ رہی ہیں وہ میں نے صرف ایک دو مرتبہ پہنے تھے، ایک دو مرتبہ کپڑے پہن لینے سے کپڑوں کا کیا بگڑتا ہے، ایسا کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''ایسا کرنے سے تمہیں کوئی فرق پڑے یا نہ پڑے ہمیں بہت فرق پڑتا ہے۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔''

''ہمیں لوگوں کی باتوں کی کوئی پرواہ نہیں، ہم چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے ہیں۔''

''بی بی! اسے چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا نہیں کہتے اسے کنجوسی کہتے ہیں۔''

''آپ کا خیال درست نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر راحیلہ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ راحیلہ کی باتوں سے نجمہ کو اتنا غصہ آیا کہ وہ کاشف کے گھر آنے تک ٹھنڈا نہ ہوا۔

''ہم جو کچھ مرضی کریں ہماری عزت خاک میں مل کر رہے گی، راحیلہ اور آصف شادی کے موقع پر ہماری بے عزتی ہی کرائیں گے، آپ ہی انہیں کچھ پیسے دلا دیں شاید اس طرح وہ کوئی ڈھنگ کے کپڑے سلوالیں۔'' نجمہ بولتی چلی گئی۔

''آصف کو تو تم جانتی ہو اس نے وہی کرنا ہوتا ہے جو اس کے دل میں آتا ہے، وہ میری بات کب سنتا ہے، میں اُسے کس طرح پیسے دے سکتا ہوں کہ میں نے تو خود......''

''بس...... بس اب تم نے شادی کے اخراجات کے لیے جہاں جہاں سے قرض لیا ہے اُس کی تفصیل مت بتانے بیٹھ جانا، شادی بیاہ کے موقع پر کسی سے پیسے پکڑ پکڑا کر ہی گزارا کرنا پڑتا ہے، خاندان میں شادیاں کون سی روز روز ہوتی ہیں۔ اگر آصف اور راحیلہ نے شادی میں ہماری بے عزتی کروائی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔'' نجمہ نے کاشف کی بات درمیان سے اچک لی تھی۔

''کیوں اپنا جی جلاتی ہو، وہ اپنے گھر کے ہیں اور ہم اپنے گھر کے، تم کھانا لے آؤ بھوک بہت لگی ہے۔''

☆......☆......☆

مقررہ تاریخ کو سب لوگ ایک بڑے شادی ہال میں موجود تھے۔ نجمہ کے گولڈن سوٹ کی سبھی تعریف کر رہے تھے۔ راحیلہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ ایک کونے میں خاموشی سے بیٹھی تھی۔ راحیلہ نے اپنے کڑھائی والے سوٹوں کو نئے فیشن کا بنانے کے لیے قمیص کے نیچے کالے رنگ کی لیس لگا دی تھی۔ کالی لیس لگنے سے لباس بہت بھلا دکھائی دے رہا تھا۔ نجمہ بار بار نفرت اور غصے سے راحیلہ اور اُس کی بیٹیوں کو دیکھ رہی تھی۔

''تمہاری دیورانی نے تم سے کچھ سیکھا نہیں تو نہیں سیکھا۔ اسے یہ بتاؤ کہ پرانا لباس پرانا ہی ہوتا ہے، کالی لیس لگانے سے پرانے فیشن کا سوٹ نئے فیشن کا نہیں بن جاتا۔'' اپنی ماموں زاد بہن طاہرہ کی یہ بات سن کر نجمہ بولی۔

''یہ ہر جگہ ہماری بے عزتی کرواتی ہے، یہ نہ جانے کس مٹی کی بنی ہے اس پر کسی بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ یہاں جو مووی بن رہی ہے وہ نہ جانے کہاں کہاں جائے گی، جہاں جہاں یہ مووی دیکھی جائے گی وہاں وہاں ہماری بے عزتی ہوگی، میں ابھی اس کی خبر لیتی ہوں۔''

نجمہ جب راحیلہ کی طرف بڑھنے لگی تو طاہرہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اسے جو کچھ بھی کہنا ہے گھر جا کر کہنا یہاں اسے کچھ کہنا مناسب نہیں، دیکھو شازیہ کتنی پیاری لگ رہی ہے، اس کا لہنگا ایک بوتیک سے سلوایا گیا ہے، جانتی ہو اس کی قیمت کتنی ہے۔"

"کتنی ہے اس کی قیمت؟" نجمہ اسٹیج پر بیٹھی شازیہ کے لہنگے کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"ایک لاکھ روپیہ۔" طاہرہ بولی۔

کچھ دیر بعد بارات آ گئی۔ سات بجے شروع ہونے والی شادی کی تقریب دس بجے رات ختم ہوئی۔ گھر پہنچتے ہی نجمہ نے طنزیہ انداز میں راحیلہ کو مخاطب کیا۔

"میں تمہیں مبارک باد دیتی ہوں کہ تم نے اس شادی میں بھی حسب معمول ہماری اور اپنی بہت عزت کروائی ہے، تم نے اپنی بیٹیوں کو بھی اپنے جیسا بنا لیا ہے، تم نے کالی لیس کپڑوں پر لگا کر جو بہت بڑی رقم خرچ کی ہے وہ نقصان اب کیسے پورا ہو گا، یہ نقصان ہونے پر میں تمہارے غم میں برابر کی شریک ہوں۔"

"بھابھی! آپ ٹھیک نہیں کر رہیں۔" راحیلہ بولی۔

"تم جو کر رہی ہو وہ ٹھیک کر رہی ہو، تم لوگوں کے کپڑے دیکھ دیکھ کر میں تو سارا وقت ہال میں شرمندہ ہوتی رہی ہوں۔"

نجمہ اور راحیلہ کی باتوں کے دوران کاشف اور آصف نے کچھ کہا تو نہیں، مگر وہ ناخوش گوار انداز میں ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ اس سے قبل کہ معاملہ طول پکڑتا آصف اپنے بیوی بچوں کو لے کر گھر کی دوسری منزل کی طرف بڑھ گیا۔

☆...☆...☆

چند دنوں بعد کاشف، دانیال اور شازیہ کی شادی کی سی ڈی لے آیا۔ جب وہ شادی کی فلم دیکھنے میں مصروف تھے تو دروازے پر دستک ہوئی۔ جنید دروازے کی طرف بڑھا اور چند ساعتوں بعد کمرے میں آ کر بولا۔

"پاپا! قمر نامی کوئی آدمی آپ کا پوچھ رہا ہے۔"

"اچھا قمر آیا ہے، میں ابھی اُس سے ملتا ہوں۔" یہ کہہ کر کاشف دروازہ کھول کر گلی میں آ گیا۔

"آج میں خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔" قمر نے اُسے دیکھتے ہی تمہید باندھے بغیر کہا۔

"میری بات سنو۔" کاشف بولا۔

"میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا، وعدہ خلافی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔"

"میں معذرت خواہ ہوں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ دس تاریخ کو تمہیں پیسے دے دوں گا، تم نے جہاں اتنا انتظار کیا ہے وہاں کچھ دن اور انتظار کر لو، میں دس تاریخ کو تمہیں لازماً پیسے دے دوں گا۔"

"تم آج جو کچھ مرضی کہو میں تمہاری کسی بات کا یقین نہیں کروں گا، میں تو آج اپنے پیسے لے کر جاؤں گا۔" یہ کہہ کر قمر نے آگے بڑھ کر کاشف کا گریبان پکڑنا چاہا تو وہ ایک دم ایک طرف ہو گیا۔

"تم حد سے بڑھ رہے ہو، میں دس تاریخ کو تمہیں پیسے دے دوں گا۔"

"تم کئی مرتبہ اس طرح کے وعدے کر چکے ہو، مگر ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا لیتے ہو، آج تمہارا کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔" قمر نے یہ بات اتنی بلند آواز میں کہی کہ ہمسائے بھی اپنے گھروں کے دروازوں پر آ گئے۔ آصف اس وقت کسی کام سے ملتان گیا ہوا تھا۔ قمر جتنا شور مچاتا جا رہا تھا گلی میں لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ شور سن کر نجمہ اور کاشف کے بچے بھی گلی میں آ گئے۔ کاشف کا گریبان اب قمر کے ہاتھ میں تھا۔ راحیلہ بھی اُوپر والی منزل سے گلی میں جھانک رہی تھی۔ شیخ مقبول کی مداخلت پر قمر کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ ان کی ضمانت پر قمر وہاں سے گیا کہ کاشف دس تاریخ کو لازماً دس ہزار روپے دے دے گا۔ کچھ دیر بعد کمرے میں کاشف اور نجمہ موجود تھے۔ ٹیلی ویژن پر شادی کی فلم چل رہی تھی۔ کاشف نے فوراً فلم بند کر دی۔ دونوں خاموش تھے۔ کاشف نے چھ ماہ قبل ہونے والی نائمہ کی شادی میں کپڑے خریدنے کے لیے قمر سے بیس ہزار روپے قرض لیا تھا۔ اس کی تنخواہ بس اتنی تھی کہ بامشکل گھریلو اخراجات پورے ہوتے تھے۔ ابھی یہ بیس ہزار کا قرض ادا نہ ہوا تھا کہ دانیال اور شازیہ کی شادی کے لیے اختر سے کاشف نے پچاس ہزار روپے قرض لے لیا تھا۔ دس تاریخ آنے میں چھ دن رہتے تھے۔ کاشف پریشان تھا کہ وہ دس ہزار روپے کس طرح ادا کرے گا۔ کاشف نے نجمہ کی سونے کی بالیاں بیچ کر اس مشکل کا حل نکالا تھا کہ اختر اس کے دروازے پر آ کھڑا تھا۔ کاشف نے اختر سے دو

ماہ بعد پیسے ادا کرنے کی مہلت مانگی تھی۔ اب دو ماہ کی بجائے تین ماہ ہو چکے تھے۔ اب اختر آئے روز ان کے دروازے پر کھڑا دکھائی دیتا۔ نجمہ کا جب بھی راحیلہ سے آمنا سامنا ہوتا نجمہ کا سر شرم سے جھک جاتا۔ نجمہ کو تو گویا چپ سی لگ گئی تھی۔ وہ دانیال اور شازیہ کی شادی کی فلم بھی پوری نہ دیکھ پائی تھی۔ شادی کے موقع پر انہوں نے جو کپڑے پہنے تھے وہ ابھی تک الماری میں لٹک رہے تھے۔ وہ جب بھی الماری کھولتی اُس کی نظر ان کپڑوں پر پڑتی تھی۔ ان کپڑوں میں اس کا گولڈن سوٹ بھی شامل تھا۔ اپنے گولڈن سوٹ کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں نمی سی آ جاتی تھی۔ شادی کے موقع پر انہوں نے صرف تین گھنٹے کے لیے یہ کپڑے پہنے تھے، مگر تین ماہ سے ان کپڑوں کے قرض کی ادائیگی کے لیے پریشان تھے۔ اختر پرسوں پولیس لانے کی دھمکی دے کر گیا تھا۔ جن کپڑوں کو پہن کر شادی میں ان کی عزت اور تعریف ہوئی تھی انہی کے باعث ان کی محلے میں بے عزتی ہو رہی تھی۔

آصف ملتان سے واپس آ گیا تھا۔ نچلی منزل میں مکمل خاموشی تھی۔ راحیلہ نے آصف کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔

"اچھا تو بھائی جان نے اختر سے شادی کے لیے قرض لیا تھا۔" آصف بولا۔

"کیا آپ اختر کو جانتے ہیں؟" راحیلہ نے سوال کیا۔

"اختر، بھائی جان کا پرانا جاننے والا ہے، میری بھی اُس سے جان پہچان ہے، میں اُس کا گھر جانتا ہوں۔"

"وہ کئی مرتبہ پیسے لینے کے لیے آ چکا ہے، اب تو وہ پولیس لے کر آنے کی دھمکی دے کر گیا ہے، مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"تم گھبراؤ مت، اللہ تعالیٰ نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" آصف نے کہا۔

☆......☆......☆

اختر ایک ہفتہ قبل پولیس لانے کی دھمکی دے کر گیا تھا۔ کاشف کو ہر لمحہ کھٹکا لگا رہتا تھا۔ قرض کی ادائیگی کے لیے اُس کے پاس اپنی موٹر سائیکل بیچنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا۔ اُس نے گھر آتے ہوئے ایک موٹر سائیکل ڈیلر سے اپنی موٹر سائیکل کی قیمت کا اندازہ لگوا لیا تھا۔ اُس نے کچھ سوچ کر جیب سے موبائل فون نکال کر اختر کا نمبر ڈائل کیا۔ چند ساعتوں کے بعد اختر سے رابطہ ہو گیا۔

"وہ پولیس......" کاشف اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اختر فوراً بولا۔

"میں اگر پولیس کی دھمکی نہ دیتا تو تم پرسوں اپنے بھائی آصف کو پیسے دے کر نہ بھیجتے، تم نے پیسے بھیج کر اچھا کیا ہے، تم ایسا نہ کرتے تو پیسے تو تمھیں ہر حال میں دینا ہی پڑتے ساتھ بے عزتی بھی ہوتی۔" اختر بولتا جا رہا تھا اور کاشف خاموشی سے سنتا جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد کاشف، نجمہ کے ساتھ اوپر والی منزل میں آصف اور راحیلہ کے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"آصف! میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔"

"بھائی جان! مجھے شرمندہ مت کریں، آپ کی عزت میری عزت ہے اور آپ کی بے عزتی میری بے عزتی ہے، ہم لوگ شادی کی تین گھنٹے کی تقریب کے لیے اپنے کپڑوں پر اس قدر خرچ کرتے ہیں کہ بعد میں مالی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں، ہمارے تمام مسائل کا حل یہی ہے کہ ہم چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائیں اور دکھاوا نہ کریں۔"

نجمہ کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ راحیلہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اسی لمحے نجمہ کو یوں لگا جیسے کالی لیس لگے پرانے سوٹ نے تین گھنٹے کی تقریب کے لیے سلوائے گئے قیمتی گولڈ سوٹ کو مات دے دی ہو۔

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 اپریل 2012ء ہے۔

مارچ 2012ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

☆ اپنی مونچھوں کو بچایئے، وزن نہ اٹھایئے۔ (عائشہ خان، ڈیرہ غازی خان)

☆ بھئی، میری مونچھ تو پکڑنا ذرا۔ (شرجیل مصطفیٰ، اٹک)

☆ کس کس سے منہ چھپاؤ گے، گھر کیسے جاؤ گے۔ (دانیال ہارون راجہ، کوئٹہ)

☆ جیسا کام، ویسا انجام۔ ([illegible]، ملتان)

☆ مونچھ گوند سے جوڑو گے تو پاؤں اپنا ہی توڑو گے۔ (عبداللہ امجد، اسلام آباد)